تعمیرِ حیات

ہفت روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۷ | ۲۵ نومبر ۱۹۷۹ء — ۴ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ | شمارہ نمبر ۲

زرِ تعاون

اندرون ملک ——— ۱۶ روپے

فی پرچہ ——— ۸۰ پیسے

بیرون ملک۔ بحری ڈاک بجملہ ممالک ۲ پونڈ

ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ۲ پونڈ

افریقی ممالک ۷ پونڈ

یورپ و امریکہ ۹ پونڈ

شمس الحق ندوی

۲۹۹۳
۱۹۵۹۳

خانۂ خدا پر بے غیرت دشمن کا ناپاک حملہ

بیت اللہ الحرام، کعبۂ مکرمہ، تمام دنیائے اسلام کی مسجدوں اور جملہ اہل ایمان کا دینی و روحانی مرکز ہے، یہ مقدس و محترم عبادت گاہ دنیا کی تمام عبادت گاہوں سے قدیم ہے، اس کی قدامت پر تاریخ، توراۃ اور قرآن مجید شاہد ہیں، اس کی حرمت و تقدس کا دوسرا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کو حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تمام اہل ایمان کا دینی مرکز بنائے جانے کی خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی اور ان کی دعا کو قبول فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس کو مرکز ایمان ٹھہرایا تھا، قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا بھی نقل کی گئی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیائے اسلام کا مرکز بنانے کے اپنے فیصلہ کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنًا۔	اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع (مرکز) اور مقام امن وسلامتی ٹھہرایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کعبۃ اللہ کو مسلمانوں نے محض جذباتی طور پر اپنا دینی مرکز تجویز نہیں کیا تھا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کو اہل ایمان کے لئے مرکز دین و ایمان قرار دیا تھا۔

قرآن مجید میں اس گھر کی تعمیر کا واقعہ بھی صاف الفاظ میں بیان فرما دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اس کی تعمیر ابراہیم خلیل اور اسمٰعیل علیہما السلام کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی ہے یہ دونوں ہستیاں مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مورث اعلیٰ تھیں اور اس طرح یہ ہستیاں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی مورث اعلیٰ اور اُن کی امام ہیں۔ اسی لئے آج جب ایک پاگل اور ذلیل دشمن نے حضرت ابراہیم خلیلؑ کی بنائی ہوئی اسی عبادت گاہ پر حملہ کیا ہے تو مسلمانوں کا ریخ و اضطراب قطعاً قابل تعجب نہیں بلکہ یہ بالکل فطری اور ایمانی جذبہ سے پیدا ہونے والی حالت ہے۔ کعبۃ اللہ پر بے غیرت دشمن کا حملہ کسی معمولی عمارت پر حملہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے مرکز دین و ایمان پر حملہ ہے، ان کو آج اپنا متاع دین و ایمان لٹتی ہوئی نظر آرہی ہے اور ایمان وہ متاع ہے جو مسلمانوں کو ہر چیز حتیٰ کہ اپنی اور اپنے ماں باپ کی آبرو سے بھی زیادہ عزیز ہے اور جس کو کوئی شئی جتنی عزیز ہوتی ہے اُس کے نقصان کا رنج بھی اس کو اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے

اہل ایمان اُن وحشی درندوں اور بدبخت شیطانوں کو جنھوں نے ان کے مرکز دین و ایمان پر حملہ کیا ہے اگر ملعون اور کمینہ کہہ رہے ہیں تو یہ ان کا بالکل فطری حق ہے اور اگر سعودی حکومت اُن بدبخت شیطانوں کو عبرتناک سزا دیتی ہے تو یہ ایمان کی غیرت کا عین تقاضا اور اس مقدس گھر کی خدمت گذاری کا قطعی مطالبہ ہے، قرآن ایسے انسانوں کو جنھوں نے اللہ کی مسجدوں میں لوگوں کو عبادت کرنے سے روکا ہو اور ان میں فساد برپا کیا ہو سب سے بڑا ظالم ٹھہراتا ہے۔

ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہٗ وسعیٰ فی خرابھا۔	اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں (لوگوں کو) اللہ کا نام لینے (عبادت کرنے) سے روک دیا ہو اور اس میں فساد برپا کیا ہو۔

اور ظلم ایسی چیز ہے جس کی عبرتناک سزا بالکل ناگزیر ہے۔ یہ کمینہ دشمن شاید یہ نہیں جانتا کہ جس محترم و مقدس گھر پر اس نے حملہ کیا ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خالق السمٰوٰت والارض نے روز اول ہی سے خود اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور جب بھی کسی ناپاک شیطان نے اس کی بے حرمتی کا ارادہ کیا ہے تو قدرت نے اس کو بڑی ذلت آمیز سزا سے دوچار کر دیا ہے، ان کمینہ صفت شیطانوں کی طرح جب ایک بدبخت اپنی فوج اور ہاتھیوں کو لے کر کعبۃ اللہ کی طرف ناپاک ارادہ سے بڑھا تھا تو خدا نے کہا تھا کہ تو اور تیرا لشکر میری قدرت کے آگے اتنا حقیر و ذلیل ہے کہ میں فرشتوں یا انسانوں کی فوجوں سے نہیں بلکہ حقیر و ضعیف چڑیوں کے ذریعہ تجھے صفحۂ ہستی سے نابود کروں گا اور پھر خدا نے ایسا ہی کیا تھا۔ قرآن نے اس عبرتناک واقعہ کا تذکرہ درج ذیل سورہ میں فرمایا ہے،

ألم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل، الم یجعل کیدھم فی تضلیل، وارسل علیھم طیرًا ابابیل، ترمیھم بحجارۃ من سجیل، فجعلھم کعصف ماکول۔	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی سازش کو برباد نہیں کیا، اس نے چڑیوں کے جھنڈ بھیجے جو ان پر کنکر لیے پتھر پھینک رہی تھیں، پس خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا۔

اگر خدا کا دشمن پاگل اور حواس باختہ نہ ہوتا تو وہ ضرور سوچتا کہ جس کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہوں۔ یہ وہی کعبہ ہے جس پر بڑھنے والے لشکر جرار کو مع اس کے دیو ہیکل ہاتھیوں کے کچل کر بھوسے کی مانند بنا دیا گیا تھا۔ پھر آج جب کہ سعودی حکومت کی شکل میں کعبہ کی حفاظت کے لئے ایک خدمتگار فوج اور کعبۃ اللہ کی حرمت پر مرمٹنے کیلئے بے قرار، کروڑ سے زیادہ اہل ایمان دنیا کے براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں تو وہ کس طرح کسی ناپاک ارادہ سے کعبہ کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے مگر خدا کے دشمن ہمیشہ عقل و خرد سے محروم اور حیا و شرم سے عاری ہوا کرتے ہیں۔

کعبۃ اللہ پر یہ ناپاک حملہ، حملہ نہیں بلکہ یہ چیونٹی کے پر ہیں، جو اس کی موت کی خبر دینے

اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپکی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ ستّر روپے ارسال فرمائیے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو ہی پی ایس سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ بتاریخ ۲۵/۱۲/۷۹ء کے مطابق ہی وی پی خرچ روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

ایک مومن کے لئے ان حوادث میں بھی خیر کا پہلو ہے

از: مولانا محمد زکریا صاحب، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

گذشتہ چند مہینوں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلسل ایسے حوادث پیش آئے جنھوں نے دارالعلوم سے تعلق رکھنے والوں کے ہوش و حواس گم کر دیئے اور جن کے تسلسل سے عقل و دماغ بالکل سُن ہو کر رہ گئے، یہ حوادث اتنے اچانک اور ایسے خلاف توقع تھے کہ دل و دماغ بہوت ہو کر رہ گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ہر شخص بس سُن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے، لیکن عقل اس سے آگے اور کچھ کام نہیں کر رہی تھی، کیا ہوا، کیسے ہوا، اب کیا ہوگا؟ کچھ معلوم نہ تھا۔

ان میں سے ہر حادثہ بالکل اچانک پیش آیا اور قلب و دماغ پر زلزلہ کی سی ایک کیفیت چھوڑ کر چلا گیا، جس نے قلب و دماغ کو جھنجھوڑ کر تو رکھ دیا تھا لیکن جس کی حقیقت کا صحیح ادراک بروقت نہ ہو سکا ہر شخص بالکل بہبوت، خاموش، کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا، اعصاب جواب دے چکے تھے اور قلب و جگر میں صبر و تحمل کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی، لیکن الحمدللہ، اللہ پر ایمان اور آخرت کے یقین نے ان مواقع پر بنہائی دستگیری فرمائی۔

ہم پر ان حوادث اور مصائب کا تسلسل مولانا محمد الحسنی مرحوم و مغفور کی وفات سے شروع ہوا۔ مولانا نے ۱۳ جون کی صبح کو کچھ درد و شکم محسوس کیا اور اسی دن رات کو نو بجے اپنے بہت سے عزیز و قریب دوستوں اور متعلقین کے علم و اطلاع کے بغیر ہی سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ اکثر لوگوں کو وفات کا علم ہوا کسی بیہوشی، بیماری کا علم نہ ہو سکا۔ مولانا کی شخصیت، ان کے علمی و دینی کمالات اور اس حادثہ سے متعلق تفصیلات آپ اسی شمارے کے دیگر مضامین میں پڑھ چکے ہوں گے۔ مولانا محمد میاں کے وفات کے ایک ماہ کے بعد تقریباً اتنا ہی اچانک اور درجہ کا دوسرا حادثہ مولانا اسحاق جلیس صاحب کے انتقال کا ہوا، مولانا مرحوم نے مولانا محمد میاں کے انتقال کے بعد ان کے صفات و کمالات اور ان کی شخصیت سے متعلق ایک مضمون تعمیر حیات میں جس کے مولانا اسحٰق جلیس صاحب ایڈیٹر بھی تھے لکھا تھا اور ان کا ارادہ مولانا محمد میاں سے متعلق تعمیر حیات کا ایک خاص نمبر شائع کرنے کا تھا، غالباً اس کا اعلان بھی تعمیر حیات میں آچکا تھا لیکن اچانک مولانا بھی اسی طرح کی پیٹ کی تکلیف میں چند دن مبتلا رہ کر اپنے مالک کے حضور میں پہونچ گئے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور بلند درجات عطا فرمائے اور اب یہ خاص نمبر مولانا کے نائبین شائع کر رہے ہیں، اور اس میں مولانا محمد میاں کے ساتھ مولانا اسحٰق جلیس سے متعلق تعزیتی مضامین بھی شامل ہیں۔ تیسرا اور آخری حادثہ (خدا کرے بس اب یہ آخری ہی حادثہ ہو) ہم سب اہل ندوہ کے سرپرست اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی اچانک رحلت سے پیش آیا۔ مولانا رمضان المبارک کے آخری دن۔ سحری کے وقت بے ہوش ہوئے اور غالباً فالج کا اثر ہوا، اور دو پہر تک اس دار فانی کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان رحیمی و کریمی کے مطابق رحمت کا معاملہ فرمائے۔ "آمین"۔ بہت کم لوگوں کو علالت بیماری کا علم ہو سکا، عام طور پر لوگوں کو انتقال ہی کی خبر ملی۔

ان تینوں حوادث سے ان مرحومین کے اعزہ یا ہم فرزندانِ ندوہ کو ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام اور انسانی دنیا کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسکا پورا ہونا بظاہر مشکل ہی نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے وارثین میں ان کے جانشین پیدا فرمائے اور اس نقصان کی تلافی اور خلا کو پُر فرمائے۔

"وما ذٰلک علی اللہ بعزیز"۔

یہ حوادث اپنے بعد غیر معمولی تکلیف دہ اثرات و نتائج چھوڑ گئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہیں۔ اس نے اپنے بندوں کے لئے ان حوادث و مصائب میں بھی خیر کا پہلو رکھا ہے، اور ان کو اپنے بندوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے جن پر کامیابی کی صورت میں آخرت کا بھی بے حد و حساب اجر و ثواب اور جنت کی اعلیٰ درجہ کی نعمتوں کا وعدہ اور اپنے خاص رحم و کرم کا اعلان فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

"وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولٰئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ وأولٰئک ھم المھتدون"۔

یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرماتے ہیں کہ آپ میری جانب سے میرے ان بندوں کو خوش خبری سُنا دیجئے جو مصیبت پڑنے پر صبر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "انا للہ وانا الیہ راجعون"، ہم سب اللہ کے ہیں، ہماری جان، ہمارا مال، ہمارے اہل و عیال اور ماں باپ ہر چیز صرف اللہ کی ہے، اسی نے یہ چیزیں عطا فرمائی ہیں، وہی ان کا لینے والا ہے اور ہم کو بھی عنقریب اسی کے حضور حاضر ہونا ہے۔ جہاں ہم کو یہ سب چیزیں اور ان کے ختم ہونے پر صبر کرنے کا اجر و ثواب پورا پورا مل جائے گا اور وہ خوشخبری یہ ہے، "اولٰئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولٰئک ھم المھتدون"، یعنی ان پر ان کے رب کی جانب سے بے شمار عنایات اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور فی الواقع صحیح راہ پر چلنے والے اور منزل مقصود تک پہونچنے والے صرف یہی لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھیگا اللہ اس کی مصیبت دور فرما دے گا اور اس کا انجام بخیر ہوگا۔ ایسے مواقع پر صبر کرنے والوں کی فضیلت کے بیان کے لئے اگر یہی ایک آیت ہوتی تب بھی کافی ہوتی۔ لیکن قرآن مجید میں جگہ جگہ اور بار بار صبر اور صابرین کی فضیلت کا بیان ہے کہیں ارشاد ہے "ان اللہ مع الصابرین"، کہیں فرمایا "انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب"، حدیث کی کتابوں میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح کے حوادث پر صبر کرنے کے کئی واقعات ذکر کیے ہیں جن میں ہمارے لئے بہترین نمونہ اور اسوہ ہے۔

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا۔ اے اللہ کے رسول آپ بھی روتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، اے ابن عوف! یہ اللہ کی رحمت ہے، پھر فرمایا، آنکھیں اشکبار ہیں اور قلب حزیں۔ اور اے ابراہیم! ہم تمہارے فراق میں غمگین ہیں۔ لیکن زبان سے وہی بات کہیں گے، جس سے ہمارا رب راضی ہو، (یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ صحیحین اور دیگر کتب میں مذکور ہے۔ کہ آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کے پاس خبر بھیجی کہ میرا بچہ لب دم ہے۔ آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے ایک شخص کے ذریعہ اسلام کے بعد یہ پیغام بھیجا "ان اللہ ما أخذ و لہٗ ما اعطیٰ، وکل شیئ عندہ بأجل مسمّٰی، فلتصبر ولتحتسب"، بیٹی سب کچھ اللہ ہی کا ہے، جو کچھ اس نے عطا فرمایا تھا وہ بھی اپنے خزانے سے عطا فرمایا تھا۔ اور جو کچھ دے رہا ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ اور اللہ کے علم میں ہر چیز کی مدت متعین ہے، لہٰذا تم صبر کرو اور اپنے صبر پر اجر و ثواب کی امید رکھو، حضرت زینب نے دوبارہ آپ کو بلوایا اور عرض کیا کہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں آپ ضرور تشریف لائیں، آپ چند صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے گئے، بچے کے نزع کا وقت تھا، آپؐ نے

(بقیہ صفحہ پر)

کے لئے نکل آیا کرتے ہیں شاید اب وقت آگیا ہے کہ اسلام اور بیت اللہ الحرام کا دشمن اپنے ناپاک ارادوں کے ساتھ صفحۂ ہستی سے نابود ہوجائے اور اپنی نحوست کے باعث اس طرح ہلاک ہو کہ کسی دل میں اس کے لئے درد اور کسی آنکھ میں ایک آنسو تک نہ ہو۔ اور وہ فما بکت علیھم السماء الارض۔ پس آسمان اور زمین اُن پر نہیں روئے۔ کا مصداق ہو۔

دوسری طرف ہمیں مسلمانوں سے بھی عرض کرنا ہے کہ ہم اور آپ اس وقت جبر حادثۂ الیمہ سے دوچار ہیں اور ہم سب پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے بلاشبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخ اسلام میں اس کی مثال تلاش نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس لئے ہمارے غم کی کوئی انتہا نہیں اور ہمارا اضطراب اور بے چینی بالکل بجا ہے، مگر ہمیں یہ حقیقت ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہم دنیا کی قوموں کی طرح کوئی عام قوم یا گروہ نہیں ہیں بلکہ ہم خیرِ امت ہیں، ہمارا رہنما قرآن اور پیروی کے لئے . . . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود ہے، جب تک قرآن اور صاحب قرآن کی سیرت کا سرمایہ ہمارے پاس محفوظ ہے (اور انشاء اللہ یہ دونوں چیزیں قیامت تک محفوظ رہیں گی)۔ اُس وقت تک ہم غم، غصہ اور اضطراب و بیقراری یا کسی بھی حالت کے وقت بس وہی طرزِ عمل اختیار کرسکتے ہیں جس کی طرف کتاب و سنت ہماری رہنمائی کرتی ہیں، دنیا کی قومیں رنج و غم یا اپنی خوشی کے اظہار کے لئے جو طریقہ بھی اختیار کرتی ہوں ہم کو ان کی نقالی زیب نہیں دیتی، ہمیں تو ہر مرحلہ پر اور نازک سے نازک گھڑی میں بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی کی پیروی کرنی ہے، ہمارے رسول ؐ کی پوری زندگی حوادث اور دشمنوں کی یورشوں میں گھری رہی ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا، مکہ مکرمہ جو آپ کا آبائی وطن تھا جہاں آپ کی ولادت ہوئی، اسی شہر میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، اسی شہر سے آپ نے معراج کا مقدس سفر کیا اور اسی میں . . مقدس کعبۃ اللہ تھا، آپ کو دشمنوں کی یورشوں کے باعث اس مقدس شہر سے ہجرت فرمائی پڑی کعبۃ اللہ سے جُدائی کا صدمہ کیسا الم انگیز صدمہ تھا مگر آپ نے اس صدمہ کے ردِ عمل کے طور پر جو طریقہ اختیار فرمایا وہ کیا تھا؟ خالقِ ارض و سما سے فریاد، دعاء و مناجات، اہلِ ایمان کو ایمان کے لحاظ سے پختہ تر بنانے کی کوشش، آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت جس مظلومیت کے ساتھ ہوئی اور ان کی ناک کان کٹی ہوئی، نعشِ جسم الم انگیز اور روح فرسا انداز میں آپ کے سامنے آئی وہ کیسا دردناک منظر پیش کرتی تھی آپ نے اس حادثۂ عظیمہ کا مقابلہ کس سیرت و کردار کے ساتھ کیا، بس یہی چیز مسلمانوں کے سوچنے کی ہے اور یہی سیرت ہے جس کی اتباع کرکے مسلمان اپنی بگڑی بنا سکتے ہیں۔

فلسطین اور بیت المقدس پر دشمنانِ اسلام نے ناپاک ارادوں کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے فوجیں آراستہ کیں اور خدا کے دشمن کو ہزاروں میل دُور دھکیل دیا اور سرزمین مقدس کو ناپاک دشمنوں سے پاک کرکے سرخروئی حاصل کی،۔۔۔ ہم نے فلسطین کا سقوط اپنی بدنصیب آنکھوں سے دیکھا لیکن ہمارے اندر صلاح الدین ایوبی جیسا جذبۂ ایمان نہ تھا ہم نے جنگ کی کسی سنجیدہ تیاری کا طریقہ اختیار کرنے کی بجائے نعرہ ریز ریلیوں اور جلوس نکالنے کا طریقہ اختیار کیا، بلاشبہ ہمارے کئی سیل لیے جلوسوں نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، لیکن اس سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوسکا، آج کعبۃ اللہ میں پیش آنے والے اس جانگداز حادثہ کے سلسلہ میں ہمیں وہ آزمودہ طریقہ نہیں اپنانا چاہیئے جو ناکام ثابت ہوچکا ہے بلکہ ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا اور جو صلاح الدین ایوبی کا طریقہ تھا، اور وہ ہے معاملہ کی صحیح نزاکت کو محسوس کرنے اور خود کو منظم اور طاقتور بنانے کا طریقہ، اگر ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں تو کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہم سچے دل سے اپنی بداعمالیوں سے خدا کے آگے توبہ کریں۔ تمام حرام کاموں کو چھوڑ دیں اور اعلیٰ اخلاق کا طریقہ اختیار کریں، ہم نہ کسی پر ظلم و زیادتی کریں اور نہ کسی کا چاپلوسی کرکے بزدلی کا مظاہرہ کریں۔

ہم اسلام کے احکام کو اپنی سیرت و کردار میں داخل کرلیں، اور ہمارا بھروسہ محض خدا کی طاقت پر ہو، دنیا والوں سے کچھ لینے کی بجائے ان کو نفع پہونچانے اور خیر کی طرف بلانے کا کردار ادا کریں، ہمارے مسائل بہت ہیں اور بڑے پیچیدہ ہیں، یہ پیچیدہ مسائل اسلام کی ہدایات پر عمل کرکے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ زندگی کو اپناکر ہی ہم حل کرسکتے ہیں۔!!

علی مبارک عثمانی

تعمیرِ حیات کے لئے

صدیوں کی حکایات خموشی میں نہاں ہیں
آنسو مرے بیگانۂ الفاظ و بیاں ہیں
مشقِ ستم ناز کا عنوان بدل دو
ہم اہلِ قلم صاحبِ شمشیر و سناں ہیں

غزل

لبریز مئے غم ہیں آنکھوں کے بھی پیمانے
محفل ہے تغافل کی باہوش ہیں دیوانے

کچھ سوزِ دروں پایا، کچھ حُسنِ جنوں پایا
دزدیدہ نگاہی سے ترغیبِ تمنا نے

کہتے ہیں کہ پھر کوئی افسانۂ غم کہیئے
ہر چند کہا اُن سے سب کچھ لبِ گویا نے

دیوانہ ہستی ہوں، فرزانہ ہستی ہوں
دنیا ہی بدل دی ہے اک وعدۂ فردا نے

ساقی کی نظر کیا ہے؟ پیمانہ ہستی ہے
دم توڑ دیا آخر کیفیتِ صہبا نے

میری شبِ تنہائی خود روٹھ گئی مجھ سے
فرمایا نہ تھا کچھ بھی یادِ رخِ زیبا نے

خود ان کی نگاہوں کو مائل بہ سخن پاکر
خاموش کیا دل کو تہذیبِ تمنا نے

ہاتھوں میں مبارک ہے دامانِ کرم ان کا
غم کیا مجھے ایسے میں دنیا جو نہ پہچانے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مکہ مکرمہ کیلئے روانگی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی، ۲ر ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوگئے وہ رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام ہونیوالی وزارت اوقاف کی دوسری کانفرنس جو یکم محرم سے ہورہی ہے شرکت کریں گے۔ اس کا پہلا جلسہ سال گذشتہ ہوا تھا، مولانا کے ہمراہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ الحسنی الندوی ہیں۔ حضرت مولانا وہاں سے قطر تشریف لیجائیں گے جہاں نئی صدی ہجری کی آمد پر ہونے والی سیرت کانفرنس میں شرکت فرمائیں گے۔

امید ہے کہ براہ مکہ مکرمہ اسی ماہ کی آخری تاریخوں تک مولانائے محترم ہندوستان واپس تشریف لے آئیں گے۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

سید سلیمان ندوی — شاعر کی حیثیت سے

(قسط ۲)

ارمغانِ سلیمان: علمی و تحقیقی فضل و کمال کے سامنے ان کی شاعرانہ حیثیت گم ہوکر رہ گئی، اسی طرح ایک عرصۂ دراز تک انکے شعری جواہر ریزے بھی پردۂ گمنامی میں مستور رہے عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ معارف کے سلیمان نمبر میں سید صاحب کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"سید صاحبؒ کی شاعری پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے اور یہ مشغل تو پھر بعد کی ہے، پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر ان کا سارا کلام یکجا تو کرلے۔"

مقام مسرت ہے کہ اس تحریر کے ٹھیک دس سال کے بعد سید صاحب کا ایک مسترشد غلام محمد نے جولائی ۱۹۶۰ء میں کراچی سے ارمغانِ سلیمان کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کرکے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ متوسط تقطیع کے ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں سید صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کو نمایاں و متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے مرتب کو اعتراف ہے کہ "یہ مجموعہ سید صاحب کی مشقِ سخن کا پورا سرمایہ نہیں بلکہ ان کی کسی بیاض کی پوری پوری نقل ہے۔ اگر اضافہ ہے تو چند ایک قطعات یا ان نظموں کا جو کہیں اور چھپی ہوئی مل گئیں۔" ارمغان سلیمان میں دورِ آخر (جو روحانی شاعری پر مشتمل ہے) کا کل خزانہ محفوظ ہوگیا ہے۔ لیکن دورِ اول کی قدیم ترین غزل اس مجموعہ میں ۱۹۰۴ء کی ملتی ہے۔ جب کہ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ سید صاحب نے پھلواری شریف کے زمانہ قیام (۱۸۹۹ء) ہی سے طرحی اور غیر طرحی مشقِ سخن شروع کردی تھی۔ اس زمانے کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ مولوی غلام محمد نے لکھا ہے:۔

"دورِ اول کے ذخیرے کے متعلق یقین نہیں آتا کہ شعر و سخن کی گرم بازاری اور سخن سنج جوان عمری کا حاصل صرف اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے خاصا حصہ محفوظ نہ رہ سکا ہو۔ اس گمان کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ اس مجموعہ میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کہیں تخلص بھی آیا ہو۔ ایسا قیاس ہوتا ہے کہ جس قلمی بیاض سے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی اور بیاض سید صاحب کے پاس رہی ہوگی جو مرورِ زمانہ سے معدوم ہوگئی، یا سید صاحب ہی نے بعد میں ایسے کلام کو جو خالص لکھنوی رنگِ تغزل کا آئینہ دار تھا۔ ثقاہت و متانت کے منافی خیال کرکے تلف کردیا ہو۔ بہرحال سید صاحب کا جتنا کچھ بھی کلام ذوق شناسانِ ادب کے سامنے ہے وہ ان کے ذوقِ شعری اور مرتبۂ سخنوری کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔

ارمغان کے فاضل مرتب نے اپنے "حسنِ ذوق" اور "پاسِ ادب کے تقاضے" سے دورِ آخر کے کلام کو پہلے بعد میں درج کیا ہے۔

سید صاحب کے تخلص کی بحث:

سید صاحب کے تخلص کا معاملہ بھی بڑا اہم ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے "رمزی" تخلص لکھا ہے۔ موصوف اپنے اس خیال میں بالکل منفرد ہیں۔ غالباً مولوی غلام محمد نے بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ،

"عموماً رفقاء کا کہنا ہے کہ وہ رمزی کے تخلص سے غزلیں کہا کرتے تھے۔"

راقم سطور کے خیال میں سید سلیمان ندوی کا کوئی تخلص نہیں تھا۔ عبدالماجد صاحب کا "رمزی" تخلص قرار دینا غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ سید صاحب اپنا بعض کلام معارف میں شائع کرتے تو اس کے نیچے واوین میں "رمزی" لکھا کرتے تھے۔ مثلاً نظم "متاعِ عمر گئی" کی بازارِ جہاں میں ارزانی"، (معارف فروری ۱۹۰۸ء) اور "درسِ مساوات" (معارف اگست ۱۹۰۸ء) کے آخر میں بائیں جانب "رمزی" لکھا ملتا ہے۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۰۶ء کے معارف میں "رمزیات" کے عنوان سے کچھ اشعار درج ہیں اور اس کے نیچے بھی "رمزی" تحریر ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا گیا کہ شاید سید صاحب کا تخلص بھی ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو انہوں نے محض "سخن کا پردہ" بنایا ہے۔ جیسا کہ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں:۔

اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہوکر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔ اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنادیا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی طراز ہیں:

"وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے تھے اور اس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لئے کوئی مخلص اختیار نہیں کیا اور جو غزلیں و نظمیں شائع کیں وہ "رمزی" کے پردے میں ہیں۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے نواب عماد الملک کی تنبیہ سے پہلے سید صاحب اپنے اشعار میں تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اسے ترک کردیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر پیشِ نظر مجموعہ میں ۱۹۰۷ء سے پہلے کی جو تین غزلیں شامل ہیں، اس میں رمزی تخلص مذکور ہونا چاہیئے تھا کیونکہ نواب صاحب موصوف کی تنبیہ تو "نوحۂ استاد" (۱۹۱۰ء) کی اشاعت پر عمل میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رمزی محض ایک عارضہ تخلص ہے جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک چلمن تھی جس کے پیچھے سید صاحب خود کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر اہلِ نظر کی نگاہوں سے مستور نہ رہ پاتے تھے۔

سید صاحب کی شاعری کے مختلف ادوار:

سید صاحبؒ کے پیشِ نظر مجموعۂ کلام میں قدیم ترین اشعار ۱۹۰۴ء کے ہیں اور مؤخر ترین اشعار ۱۹۴۵ء کے اس طرح ان کی شاعری کی مدت تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان کی شاعری کا ستارہ دوسرے ہم عصر باقاعدہ شعراء مثلاً حسرت موہانی، فانی اصغر اور جگر کی طرح بلا انقطاع مدت مسلسل جاری نہیں رہا۔ بلکہ درمیان درمیان میں اس کی خشکی کے وقفے بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں شعر گوئی سے طبیعت بالکل ہٹ گئی تھی صرف مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سے ان کی رحلت تک کے درمیانی سوا سالہ زمانے میں سید صاحب کے جذبات اور واردات قلبی میں جو جوش اور ابال پیدا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ایک وافر سرمایۂ شاعری وجود میں آگیا۔ جو باقی عہد کے ذخیرہ سخن پر کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ارمغان سلیمان کے مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دورِ اول میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کا کلام شامل ہے اور دورِ آخر کا کلام اپریل ۱۹۳۷ء سے دسمبر ۱۹۴۵ء تک مشتمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے رنگِ سخن اور ذوق کے تدریجی ارتقا کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کو تین ادوار میں منقسم کرنا چاہیئے۔

پہلا دورِ مشقِ سخن کا زمانہ:

پہلا دورِ زمانہ طالب علمی کی مشقِ سخن پر مشتمل ہے اس دور کو ان کا تربیتی دور کہا جاسکتا ہے۔ جب سید صاحب لکھنوی رنگِ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مرآۃ الغیب کے پرستار تھے۔ اسی کی کامیاب نقالی اور اتباع و تقلید میں ساری طباعی صرف کرتے چنانچہ ان کے ابتدائی عہد کا کلام بھی اسی رنگ آہنگ کا مکمل نمونہ ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و صفائی کے ساتھ اشعار میں نزاکت اور لوچ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی دبستانِ سخن کا طغرائے امتیاز یعنی خارجیت کا میلان اور رنگینی شوخی اور رعنائی خیال کی خصوصیات اس پر مستزاد تھیں۔ اس عہد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری
بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
چین سے بیٹھنے دے گی نہیں ہم دونوں کو
بھج کر یہ شوخی تیری، بھجے کو یہ وحشت میری
چاہے تم آج نہ ہو میری دعا کے قائل
یہ تمہیں یاد کبھی آئے گی الفت میری
بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے
اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپا جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار
اب کیوں شبِ وصال وہ شرما جاتے ہیں

ادھر گلچیں خفا ہے اور اُدھر مہتاب ہے بجلی
خدا حافظ ہے اب طبلِ رحیل اے آشیانے کا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں
نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

دوسرا دورِ پختگی کا زمانہ:

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا قیام

دار المصنفین (۱۹۱۴ء) کے بعد سے شروع ہوا اور مولانا اشرف علی تھانوی کی ارادت یعنی ۱۹۴۲ء تک قائم رہا۔ اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب انکی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی۔ بلکہ ان کے جذبات میں لطافت اور خیالات میں متانت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔

سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں ایک غزل اعظم گڈھ کے کسی مشاعرے کے لئے لکھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

عجب طرح کا ایک سچ گفتگو میں ہے
وگرنہ "میں" وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

یہ غزل جب ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذری تو انہوں نے سید صاحب کو اس کی داد دیتے ہوئے لکھا۔ "آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ہے ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے"

اس غزل کا درج ذیل شعر بیتا الغزل کہلانے کا مستحق ہے ؎

ذہن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی
عجیب لذت پنہاں مرے لہو میں ہے

(اسی غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں) ؎

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں
پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

خطاب غیر ہیں گو لاکھ احترام رہے
مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ تو میں ہے

نگاہ لطف ادھر ہو کہ آ چلا ہے کیف
بجا رکھ میرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

جون ۱۹۱۸ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک غزل عبدالماجد دریابادی کو جیل سے لکھ کر بھیجی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

اس غزل سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں مولانا دریابادی اور سید صاحب دونوں نے بڑی مرصع غزلیں کہہ ڈالیں۔ سید صاحب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تشہیر کا باعث نہ ہو دامان قبا دیکھ
یہ عالم امکاں ہے تماشا گہ قدرت
جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دست قضا دیکھ

تاثیر و فساد عمر باطل ہے سراسر
اب شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے فدا دیکھ

بیکار ہے دشواری منزل کی شکایت
بے راہ روی خضر راہ نما دیکھ

حرفِ مطلب کہا نہیں جاتا
بے کہے بھی رہا نہیں جاتا

لطف لطف سے نہ دیکھ مجھے
یہ ستم بھی سہا نہیں جاتا

عشق کی تازگی ہے آنسو سے
بے سبب تو بہا نہیں جاتا

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ
سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں
اے خارِ دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے
ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل سلگنے لگتی ہے
نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانے کی ہمت ہے
سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے
یہ دل وہ شیشۂ نازک ہے میرے سینے میں
نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے
چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
شکست روئے بت خانہ ہو نہیں سکتی
خلیل اگر خود ہی بت تراش ہو جائے

اظہار جذب عشق پہ مائل تو ہو گئے
تیرا اثر کہ آج وہ گھائل تو ہو گئے
مضطر وہ برق وش تھا الٹنے کو خود حجاب
ہم آپ درمیاں میں حائل تو ہو گئے

میرے انوارِ تجلی سے فضا پُر نور ہے
میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے
دہم سے بڑھ کر نہیں ہے فرق جبر و اختیار
غور سے دیکھو کہ جو مختار ہے مجبور ہے

دعویٰ غلط ہے عشق کی تمکین و ہوش کا
ممکن نہیں ہے حسن سے ہو بے نیاز عشق
کتنی ہو مختصر یہ کہانی حیات کی
کھولے اگر نہ حسن کی زلف دراز عشق

لکھنوی رنگ: مذکورہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دراصل سے گو سید صاحب کے خیالات میں نسبتاً جدت میں شدت اور زبان و بندش میں صفائی اور پختگی پیدا ہوتی گئی لیکن بنیادی طور پر سید صاحب اب بھی اس رنگ و آہنگ سے ہم رنگ و آہنگ سے ہم رنگ رہے، جسے شعر و ادب کی تاریخ میں "لکھنویت" کا نام دیا جاتا ہے۔ بنتی اعتبار سے ہم ان اشعار کو معیاری قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شاعری کا خواہ پہلا دور ہو یا دوسرا، دونوں کی مشق سخن تمام تر تصنعی اور روایتی ہے۔ اور وہ خود بھی اس کو "رسمی و نقلی" شاعری کا نام دیتے ہیں۔ امیر مینائی کے گہرے اثرات کے باعث وہ کلی طور پر "لکھنویت" سے اپنا دامن دوسرے دور میں بھی نہ چھڑا سکے۔ جس ابتذال و سطحیت، خارجیت، معاملہ بندی اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شوخی و رنگینی کے باعث لکھنوی اسکول کے شعراء مورد نقد و جرح بنے، اس کے نشانات سے بایں زہد و تقویٰ سید صاحب کا کلام بھی خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کل شب مرے آنے سے خفگی بجا سہی
ہے کیوں نگاہِ ناز مگر شرم سار آج

دستِ گستاخ کو اجازت دو
منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے
مجھے جب بوسۂ لب سے بھی وہ شاد کرتے ہیں

وہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں
ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

گیسو سنگھا کے ہوش میں کیوں لا رہا ہے تو
لو ہی تو چھوڑ دے مجھے اے یار چھوڑ دے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اشعار قطعی تقلیدی اور روایتی طور پر کہے گئے ہیں شاعر کے اصل مزاج کے آئینہ دار ہرگز نہیں۔ بقول غلام محمد "وہ ایک سراسر دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کا شخصی شاکلہ، تمام تر دینی رنگ قبول کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اس زمانے میں جو کچھ مشقِ سخن کی وہ (بجز ایک نعت اور دو نوحوں کے) محض رواج اور ماحول کی مطابقت کے لئے تھی"۔ چنانچہ ان روایتی اور تقلیدی غزلوں میں بھی سید صاحب کے بنیادی مزاج کی جھلکیاں کہیں کہیں دیکھی جا سکتی ہیں مثلاً اس شعر میں ؎ حدا تر سی کی جھلک۔

لب پہ ہے نام خدا دل میں ہے سودائے صنم
مجھ کو اللہ کرے دیکھتا اللہ نہ ہو

انسان کی حقیقت

از: عبدالکریم پاریکھ

(پیامِ انسانیت کے عنوان پر ایک تقریر کے کچھ اجزاء)

یہ دنیا عجیب و غریب رنگینیوں، امنگوں چاہتوں اور منصوبوں میں آدمی کو بہلاتی پھسلاتی رلاتی، ہنساتی رہتی ہے، اس کا راز نہ جہ کم لوگوں پر کھلتا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے، یہ ناپائیدار زندگی اور غیر مستقل فانی حیات کو لئے انسان چند دنوں کے لئے روتا ہنستا آتا ہے اور چلا جاتا ہے بعد میں اس کے غم میں رونے والے لوگ بھی چند دنوں میں چلے جاتے ہیں، جا کر کوئی آتا نہیں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ آخر یہ چکر ہے کیا؟ لیکن کوئی ذرا غور و فکر تو کرے، عقل و دانش اور تجربات کی روشنی میں آس پاس کی دنیا کو اوپر نیچے دائیں سے بائیں اور آگے پیچھے سے دیکھے تو کچھ نہ کچھ حقیقت کا سراغ مل جاتا ہے، مگر افسوس لوگوں کے پاس اس حقیقت کو تلاش کرنے کا وقت نہیں۔ اس دنیا میں آتے ہیں مر کر چلے جاتے ہیں لیکن اس کے بارے میں سوچنے کا مادہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔

آدمی مر جاتا ہے اور ہم اس کے جسم کو گھر میں رکھنے کے بجائے قبرستان یا مرگھٹ میں لے جاتے ہیں اور اس کی آخری رسومات پوری کر دیتے ہیں۔ ہائے یہ انسان اب اتنا بے قیمت کیوں ہو گیا ہے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے؟ اگر ہم اس بحث کا موضوع "انسان کی حقیقت" مقرر کریں اور پھر سوچیں، اپنی عقل کا استعمال کریں دوسروں کے بتائے ہوئے نکات پر سوچیں، واجبی غیر واجبی، ممکن ناممکن سب کچھ ناپ تول کر کے ملا کر جوڑ کر سیکھ کر پڑھ کر سن کر بول کر بتا کر معلوم کریں کہ آخر یہ کیا چکر ہے جو ہمارے آس پاس گھیرا ڈالے ہوئے ہے اپنی مرضی سے آنے نہیں دیتا، اپنی مرضی سے جانے نہیں دیتا اور جب چلے جاتے ہیں تو نہ جانے کہاں جاتے ہیں اور کیا ہوتا ہے — یہ سب باتیں سوچنے کی ہیں۔

آئیے پہلے ہم انسان کے اوپر غور کریں کہ انسان کیا ہے، آپ انسان ہیں میں انسان ہوں، ہندوستان میں ۵۰ کروڑ انسان ہیں، پڑوسی ملکوں میں بھی بنگلہ دیش، پاکستان میں بھی چین اور جاپان میں بھی، انسان ہی یورپ و ایشیا میں بھی ہر جگہ انسان ہیں کیا یہ سب لوگ انسان ہیں؟ سب لوگ اپنے آپ کو انسان کہتے ضرور ہیں لیکن کیا کسی کا دعویٰ آجتک آپ نے بے دلیل تسلیم کیا ہے، لیکن ہم کسی اور کے پیچھے کیوں پڑیں خود اپنے آپ پر نظر ڈالیں کہ کیا ہم انسان ہیں؟

جی ہاں انسان ہیں زبان بولتے ہیں بھاشا "Language" لیکن کیا آپ کی زبان ہے اس لئے آپ کوئی خاص زبان بولتے ہیں کیا جانور کو زبان نہیں وہ کیوں نہیں بولتا جانور کی زبان تو گز بھر کی ہوتی ہے لیکن اسے قوت ناطقہ کیوں نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں بلکہ ہماری اور اس کی تخلیق میں فرق ہے اسکی زبان آپ سے زیادہ موٹی مضبوط لمبی، ہونٹ آپ سے بھی بڑے بڑے حلق اور گل پھڑے گال اور زبان کاٹا تو آپ سے بھی زیادہ مضبوط مگر آپ بولتے ہیں وہ بولتا نہیں صرف بگڑاتا، بھونکتا، دہاڑتا، چلاتا، چیختا، میاتا یا سرسراہٹ کرتا ہے بولی آپ کے سوا کوئی بولتا ہے؟ آپ کہیں گے کہ ہاں، بولی ہمارے سوا کوئی نہیں بولتا۔ کیوں نہیں بولتا آپ کے پاس اسکول کالج ہے اس لئے آپ بولتے ہوں لکھتے پڑھتے ہوں گے.... نہیں نہیں ایسی بات نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا کالج کھول کر بلبلوں، بھینسوں، گدھوں کتوں کو تعلیم دیکر انہیں بولنا سکھا سکتے ہیں! نہیں تو پھر بات کیا ہوئی؟.... اب یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ انسان ہیں آپ کی زبان بولی لکھاوٹ یہ ایک ممتاز وصف اور فضیلت ہے جو آپ کو دوسری بہت سی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے لیکن کیا یہ وصف آپ کا ذاتی ہے... نہیں عقل کہتی ہے یہ عطائی ہے، وہبی ہے بخشا اور عنایت کیا گیا ہے کسی نے آپ کو وجود کا جامہ پہناتے وقت ایک خاص ڈیزائن سے تخلیق کر دیا ہوگا تب ہی آپ اس رتبۂ علیا کو پہنچے رہتی ہیں لیکن کیا ہماری اپنی مردم آزاری اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والی حرکتیں لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری، فساد آگ لگانا یہ تمام چیزیں آخر ہم ہی تو انجام دیتے ہیں مگر کیا ہماری یہ حرکات ہمیں یاد رہتی ہیں ہم ان پر نادم ہوتے ہیں اگر ایسا ہے تو واقعی ہم ایک نچلے درجے کے انسان ہیں، لیکن اگر یہ بھی نہیں تو کیا ہم انسان ہیں؟ .... یہ سوال پھر اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

جامہ تخلیق پہننے میں ذی اختیار نہیں، تو پھر کون ہے جو ہم کو وجود کا جامہ پہناتا ہے اور اپنی مرضی اور منصوبے کے تحت ہمیں انسان بناتا ہے اور پھر ایک مخصوص مدت مقررہ پر ہمیں اس دنیا سے واپس بلاتا ہے مذہب کی بات کوئی مانے یا نہ مانے لیکن کیا یہ عقلمندی ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا دیا جائے کہ انسانی وجود حاصل کرنے میں ہمارا کوئی دخل نہیں نہ ہماری کوئی کوشش۔

پھر انسان نام کا انسان، اچھا انسان اور پرے انسان اندر سے حیوان بھیڑیا، بھالو، شیر چیتا، سانپ، سانڈھ ظاہر میں آدمی باطن میں غیر آدمی بلکہ آدم خور یہ بھی ہمارے اور آپ کے تجربے کی بات ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا دوسروں کی غیر انسانی حرکتیں ہمارے علم میں خوب محفوظ رہتی ہیں لیکن کیا ہماری اپنی مردم آزاری اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والی حرکتیں ہمیں یاد رہتی ہیں؟ ہرگز نہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا ذاتی کمال ہے تب کیا یہ ماننا نہیں پڑے گا کہ ہمارا وجود اپنی ذات کا مرہون منت نہیں اور ہم اپنی مرضی سے

بقیہ صفحہ ۲

بچے کو اپنی گود میں لے لیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا، آپ رو رہے ہیں، آپ نے فرمایا سعد یہ اللہ کی رحمت ہے، جو اللہ اپنے محمد بندوں کے دلوں میں فرماتا ہے، ان دونوں واقعات میں آنکھوں سے آنسو جاری ہونے کے باوجود صبر اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے کا کیسا سبق ہم امتیوں کے لئے ہے، امام مسلم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اس کا ہر حال، اس کے لئے باعث خیر و برکت ہے، اگر اس کو آرام و راحت سکون و اطمینان اور خوشی و مسرت نصیب ہوتی ہے تو وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ نعمتیں اس کے لئے باعث خیر ہوتی ہیں، اور اگر اس کو مصیبت، فکر و پریشانی اور حوادث پیش آتے ہیں تو ان پر صبر کرتا ہے اور یہ حوادث و مصائب بھی اس کے لئے باعث خیر اور آخرت کے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جاتے ہیں، بخاری و مسلم کی ایک حدیث کو آپؐ نے فرمایا "ما أعطي أحد عطاءً خيرًا واوسع من الصبر" اللہ کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت صبر سے زیادہ باعث خیر و برکت اور ہمہ گیر نہیں ہوتی۔

اللہ کا ہر معاملہ اپنے مومن بندوں کے ساتھ رحم و کرم ہی ہوتا ہے، اور طبعی تکلیف کے باوجود جو اپنے اختیار میں نہیں ہوتی، ایک بندۂ مومن کو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی اور ان حوادث و مصائب پر صابر رہنا چاہئے یہی ایمان کا تقاضا ہے اور اسی میں آخرت کا بے حد و حساب اجر و ثواب ہے اور اللہ کی رضا ہے، آخر میں اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث ذکر کرتا ہوں حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ، تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے کسی بندے کے عزیز و قریب اور محبوب شخص کو اپنے پاس بلا لیتا ہوں اور میرا بندہ میری رضا اور آخرت کے اجر کی امید پر صبر کرتا ہے تو میں اپنے ایسے بندے کو جنت ضرور عطا کرتا ہوں۔

براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت حوالۂ خریداری نمبر ضرور تحریر کریں

ڈاکٹر محمد اقبال کا
عقیدۂ توحید

ڈاکٹر ایم۔ ایچ خان عرشی

دین سے کا پہلا بنیادی عقیدہ، توحید ہے، اس سے متعلق قرآن پاک سے جو تعلیم اور روشنی ملتی ہے وہ اس قدر فطری، عقلی، کامل اور جامع ہے کہ دوسرے ادیان اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ انسان کی دینی و دنیوی کامیابی اور نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ خدا کی ذات وصفات پر صحیح معنوں میں ایمان رکھتا ہو۔ لیکن آج اقوام عالم اسی بنیادی عقیدے سے بہت دور جا پڑی ہیں اور وہ خدا کا اتنا ادنیٰ درجہ کا تصور رکھتی ہیں کہ اس کا خلاف عقل و فطرت ہونا ہر سلیم الفطرت انسان پر ذرا سے تفکر سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ نوع انسانی کے ایک بلند و بالا تر ہستی کا اقرار و اعتراف، ہمیشہ اس لئے اس کو موجود رہا کہ اس کا احساس وجدانی طور پر فطرت انسانی میں داخل ہے مگر مختلف اسباب و اثرات، فطرت انسانی پر قسم قسم کے پردے ڈالتے اور اسے کچھ سے کچھ بناتے رہے اور یہ فطری تصور دنیا کے اقوام و مذاہب میں عجیب عجیب لباسوں میں گم ہو کر خود ساختہ وخیالی معبودوں کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

قرآن کریم نے اس سلسلہ میں جو اولین پیغام اقوام نوع انسانی کو دیا وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے اس کے دو حصے ہیں ایک سلبی یعنی اس امر کا یقین کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جسے آقا، مالک، حکمراں اور مربی تسلیم کیا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے اور جسے حاجات کا قبلہ مقصود بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے یعنی پہلے ذہن میں جو کچھ ہو اس کو مٹا دینا اور بھلا دینا چاہئے جب ذہن اس طرح صاف ہو جائے تو پھر اس میں اللہ کا تصور بٹھایا جائے اور اعمال کی ایک نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ ایجابی پہلو ہے کہ تمام قوتوں کے انکار کے بعد صرف معبود حقیقی کی غلامی اختیار کی جائے۔ تمام ذہنی، فرضی، وہمی اور خیالی معبودوں اور قوتوں کو راستے سے ہٹا کر خدا اور بندے سے براہ راست تعلق پیدا کر دیا جائے۔ اقبالؒ

ملت بیضا تن وجاں لا الٰہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما — پردہ بند از شعلۂ انکار ما

جب ایک انسان عقل کے تراشے ہوئے خداؤں کی تخریب پر آمادہ ہو گیا تو اس نے لَا پر عمل اور توحید پر قدم اٹھا لیا مگر اب وہ خطرناک مقام آ گیا کہ جہاں ممکن ہے محسوسات کا خوگر انسان جھوٹ کو سچ، فریب کو حقیقت اور باطل کو حق سمجھ بیٹھے اور اپنی فطرت صالحہ کو بدل ڈالے اور حقیقت مجردہ کو خارجی پردوں اور لباسوں میں گم کر دے۔ آج دنیا کے مذاہب اسی چکر میں سرگرداں ہیں۔ اس مشکل مقام پر آ کر الٰہ ذہن انسانی کو نہ صرف گمراہی سے بچاتا ہے بلکہ محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقائق حسن و عشق تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس تخریب و تعمیر میں لَا اِلٰہَ سے بیگانہ ہو جائے تو اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہو گی جیسے اصنام دنیوی سے خدائی منصب چھین کر کسی مقدس مآب انسان کو دیدیا جائے یا کسی فرعون کے ہاتھ سے عنان اقتدار لیکر اس کو دست ناتواں کے سپرد کر دیا جائے۔ گویا ایک باطل کو مٹا کر اس کی جگہ دوسرا باطل قائم کر دیا جائے۔ افسوس کہ آج امت مسلمہ بھی سیاسیات اور مذہبیات کے اسی چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی حقیقت کو یوں واضح فرماتے ہیں ؎

بہار زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا — پیام موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ
وہ ملت، مرچکی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقین جانو ہوا بیزار اس امت کا پیمانہ

غور فرمائیے علامہ مرحوم نے ان دو شعروں میں ذہن انسانی کو کہاں سے کہاں پہنچانا چاہا ہے۔ کیا آج قوم اسی لئے ایسی گہری نیند میں نہیں مبتلا ہے جو اس کے لئے پیام موت ہے کہ اس نے لَا کو الّا سے بیگانہ اور بے تعلق کر دیا۔ زبان سے تو لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند ہوتی ہے مگر ہمارا دل صنم خانہ بنا ہوا ہے عام طور پر بڑی سادگی کے ساتھ رسماً اس کلمہ کو پڑھ لیا جاتا ہے مگر اس کا ادنیٰ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس فیصلہ کن اقرار کا عقلی اور عملی اقتضا کیا ہے؟ اور اس کے مطالبات کیا ہیں اقبالؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ؎

شرک پیدا ہو گیا توحید رخصت ہو گئی — بے زری، ناطاقتی، جزو طریقت ہو گئی

اقبالؒ وہ پہلے شخص ہیں جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں معقول اور دل نشیں پیرایہ میں اس کلمہ کے جملہ تقاضوں اور مطالبوں کو پیش کر کے حقیقی زندگی کی دعوت دی ہے اور دل و دماغ کو صحیح معنوں میں مومن بنانا چاہا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت تک پہنچانا انسانیت کا کمال ہے اور اسی متاع بے بہا کا حصول صحیح عقیدۂ توحید پر ایمان لائے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ انہوں نے دنیا والوں کو بتایا ہے کہ خدا شناسی ذہنی، اور اکی، کی کیفیات کا نام نہیں ہے بلکہ روحانی شاہد کی تنویر ہے۔ جس سے روحانی ارتقا کی تمام راہیں واضح اور منور ہو جاتی ہیں ؎

ولایت، بادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں اسی اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے ایک وجد آفریں کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک تمام قوانین الٰہی کا محور یہی ایک بنیادی عقیدہ ہے اور سب کو اسی مرکز سے قوت پہنچتی ہے فرماتے ہیں ؎

دیں ازو، حکمت ازو، آئین ازو — در ازو، قوت ازو، تمکین ازو

یہ کلمہ انسان کو اس کے اعلیٰ مقام سے واقف کراتا ہے اور اس میں عزت نفس اور خودداری کا جذبہ پیدا کرتا ہے اس لئے کہ اس پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اور مخلوقات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو اپنا خدا بنائے اور کسی کے آگے اپنا سر نیاز جھکائے صرف خدا ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے اس کے سوا کوئی نفع و نقصان پہونچانے والا نہیں ہے۔ موت و حیات، عزت و ذلت، سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آں کہ ذاتش واحد است و لا شریک — بندہ اش ہم در نماز د باشریک
مومن بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ او، برنتابد، ہمسرے

اس لئے کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے ہے اور وہ کسی کے لئے نہیں ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

متاع دین و دنیا سے تمتع کا یہ ایک پہلو بھی ہے کہ یا تو اس کی غلامی میں عزیز کیجائے یا اسے اپنے قبضہ اور اختیار میں لے لیا جائے تاکہ دنیا کے انسانوں کو اس کی غلامی سے نکال کر حکومت الٰہیہ کا تابع بنا دیا جائے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

عقیدۂ توحید، انسان میں بلندی کردار اور عزت نفس کا غیر فانی شعور پیدا کرتا ہے اس عقیدہ کی رو سے کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمراں بن جائے یا خدا کے سوا کسی کی غلامی کو جائز قرار دے۔ فرماتے ہیں ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اگر انسان کی نگاہوں سے فکر و عمل کی یہ بلندی اوجھل ہو جائے تو اقبالؒ کے نزدیک ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبالؒ اس ترقی اور آزادی کے طالب نہیں ہیں جس کو حکمراں عطا کریں ؎

خریدے نہ جس کو وہ اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

اسی طرح وہ اس آزادی کو آزادی نہیں سمجھتے جو ہر فرد و بشر کو شتر بے مہار بنا دے ؎

اس قوم کو ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

پس اگر حقیقی ترقی اور آزادی مطلوب ہے تو دلوں میں توحید کی روح کو پیدا کر کے نظام الٰہی کو جاری کرنا چاہیے جو دنیا کے موجودہ شیطانی نظام کو تہہ و بالا کر دے ؎

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

ایٹم بم کیا ہے؟

آفتاب احمد خاں

ہمارا تعلق زمین سے ہے جو نظام شمسی کا ایک چھوٹا سیارہ ہے۔ اس کرہ کی تین چوتھائی سطح یعنی ۱۴ کروڑ مربع میل دو ہواؤں یعنی ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک کیمیاوی مرکب یعنی ہائیڈروجن آکسائڈ سے ڈھکی ہوئی ہے عام اصطلاح میں اسے پانی کہتے ہیں۔ سمندروں کا پانی کھارا اور زمین کے اندر کا پانی کم و بیش میٹھا ہے۔ ان دو قسم کے پانیوں کا تناسب ۹ ہزار اور ایک کا ہے، یعنی ۳۱ کروڑ مکعب میل پانی سمندروں کی شکل میں اور ۲۵ لاکھ مکعب میل پانی زمین کے اندر موجود ہے یا رہے کہ ایک مکعب میل میں ۱۰ ارب گیلن پانی سماتا ہے ۵ کروڑ مربع میل میں میدان صحرا اور پہاڑ ہیں ان سب کا محیط کرہ ہوائی ہے جس کا بیشتر حصہ نائٹروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہے۔ ہوائی کرہ کی آخری حد ۲۰۰ میل کی بلندی تک ہے۔ آگے خلا ہے۔ زمین کی کشش ثقل پانی اور ہواؤں کو زمین کی سطح کے ساتھ چمٹے ہوئے ہے اور خلا میں تحلیل ہونے سے روک رکھا ہے۔ ہائیڈروجن، نائٹروجن اور آکسیجن کے علاوہ ۸۹ عناصر اور ہیں جن سے مٹی اور چٹانیں بنی ہیں ۱۲ عناصر جو غیر مستقل عناصر ہیں ایٹمی بھٹی میں مصنوعی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ ان ۸۹ عناصر میں کچھ گیسیں ہیں کچھ دھاتیں ہیں جن سے ہم روزمرہ کے کام لیتے ہیں۔ کچھ غیر دھاتیں ہیں، جیسے کاربن یعنی کوئلہ (ہیرا یعنی الماس بھی کرسٹل کاربن کی خالص شکل ہے۔) فاسفورس گندھک سلیکان جس سے ریت بنی ہے۔ آیوڈین آرسینک (سنکھیا) وغیرہ وغیرہ اور کچھ تابکار عناصر ہیں۔ وزن متناسبہ یعنی پانی کے مقابلہ میں سب سے ہلکا عنصر ہائیڈروجن ہے اور سب سے بھاری عنصر ٹریسم کہلاتا ہے جس کا وزن متناسبہ ۲۲۶ ہے۔ سونے کا ۱۹۷ ہے۔ یہ ایک دھات ہے جو بلبوں کے تار میں استعمال ہوتی ہے جو سب سے کم درجہ حرارت پر پگھلنے والی دھات میٹریم ہے جس سے سگریٹ لائٹر تیار ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ حرارت سے پگھلنے والی دھات ٹنگسٹن ہے۔ اول الذکر کا پگھلنے کا درجہ ۲۸۷ سنٹی گریڈ ہے اور موخر الذکر کا ۳۴۱۰ سنٹی گریڈ ہے۔ اس عالم آب و خاک باد میں ایک مجموعۃ العضول حقیقت حیات اور موت کی ہے چند عناصر کی ترتیب و تسویہ سے نباتات حیوانات اور بالآخر انسان جیسی مخلوق معرض وجود میں آ چکی ہے ایک نقش فنا ہوتا ہے دوسرا نقش ابھر آتا ہے۔ انسان کی شکل میں حیات اپنے شعور کے کمال تک پہنچی ہوئی ہے اسی مشت خاک کو ذوق جمال بھی عطا ہوا اور دل و نظر بھی اسی آب و گل کے اعجاز ہیں۔ عشق و محبت مسرت و غم شعر و فلسفہ اور ہزاروں کمالات علم و فن انسان کے واردات قلب کی پیداوار ہیں اور یہ سلسلہ بحر نا پیدا کنار کی طرح ہزارہا برس سے موجزن ہے۔ قدرت کے اس کمال صنعت گری کی گہرائیوں میں جس قدر گہرے چلے جائیں گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں ؎

ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
خود اس کمال کے آگے بے بس کھڑی ہے

سینکڑوں نیوٹن اور آئن سٹائن ہیبت و تحیر نظر آتے ہیں۔ وجدان سر بسجود ہے۔ کئی شیکسپیئر، گوئٹے، سعدی و حافظ غالب و اقبال شاعری کے ہزاروں دیوان کر گئے۔ کتابوں کی ہزاروں تفسیریں لکھی گئیں اور خواب جوانی کی لاکھوں تعبیریں بیان کی گئیں مگر خالق موجودات کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آئیں۔

"سات سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلمیں بن جائیں پھر بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔"

آہستہ آہستہ قدرت خود قلب انسانی کی راہ نمائی کرتی ہے۔ ایک پردہ کے بعد دوسرا پردہ سرکا دیا جاتا ہے نئے افکار جنم لیتے ہیں اور نیا جہاں معرض وجود میں آ جاتا ہے سائنس کا علم کاوش و محنت کے ساتھ ساتھ کچھ الہام بھی ہے جو قلب انسانی پر عالم غیب سے مرتسم ہو جاتا ہے۔

سائنس نے منجملہ دیگر امور کے اپنی توجہ اس حقیقت پر مرکوز کی کہ کوئی عنصر ہوا کی شکل میں ہے کوئی ٹھوس جسم کی صورت میں۔ کوئی سفید جیسے چاندی کوئی سلیٹی جیسے لوہا اور سکہ اور کوئی خوبصورت اور جاذب نظر جیسے پرتھن خود بھی مرتا ہے۔ جس کا تعلق سونے سے عیاں ہے۔ آیا ان عناصر کی ترکیب خلقی میں کوئی باہمی ربط ہے یا ہر عنصر اپنی ذات میں علیحدہ تخلیق ہوا ہے۔ اس کو سائنس کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا جب ۱۸۹۸ء میں میڈم اور پائیوی کیوری نے ریڈیم دریافت کی۔ بعد میں یورانیم کی دریافت ہوئی۔ فرانس ہی کے سائنس داں ہنری بکرل نے تابکاری کا کھوج لگایا۔

تابکاری پر سے زیادہ تحقیق و کاوش کا سہرا انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ طبیعیات کی ایک ٹیم کے سر ہے جس کے سربراہ نیوزی لینڈ نژاد پروفیسر اور فورڈ تھے۔ ریڈیم تابکار عنصر ہے اس میں سے روشنی اور حرارت ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیم دھات کی شکل میں ہو یا اس کا مرکب گرم حالت میں ہو یا سرد تابکاری کی خصوصیت کسی صورت زائل نہیں ہوتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ریڈیم آہستہ آہستہ خود بخود تحلیل ہو کر سیسے کی قسم کی ایک دھات میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ رزر فورڈ اس نتیجے پر پہونچے کہ ریڈیم سے تین قسم کے ذرات یا شعاعیں ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ایلفا پارٹیکل جو بعد کی تحقیقات سے ہیلیم گیس کا ایٹمی مرکز ثابت ہوا۔ دوسرا بیٹا پارٹیکل جو منفی چارج کا ایک سیچھوٹا ذرہ ہے اسے الیکٹرون کہا جاتا ہے تیسرے X-Ray کی قسم کی انتہائی تیز شعاعیں جنہیں گاما شعاعوں کا لقب دیا گیا رودر فورڈ نے ایٹم کا ماڈل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا یہ تو جانتی تھی کہ تمام مادی اشیاء ایٹمی ذرات سے بنی ہیں مگر اس کے اندرونی شکل سے ناواقف تھی بعد میں دو اور مشہور سائنسدانوں بوہر اور سومر فیلڈ نے اس ماڈل میں کچھ ترمیم کی یہ ثابت ہو گیا کہ ایٹم کا اندرونی نظام ہو بہو نظام شمسی سے مشابہ ہے یعنی سورج اور اس کے گرد سیارگان گردش پذیر۔ ایٹم کا مرکز جس پر بجلی کا مثبت چارج ہوتا ہے اور اس کے گرد انتہائی تیز رفتاری سے گھومتے ہوئے الیکٹرون جن پر بجلی کا منفی چارج ہوتا ہے۔ انکشاف ہوا کہ سب سے ہلکے عنصر یعنی ہائیڈروجن کا ایٹم بھی سب سے ہلکا ہے۔ اس کے مرکز میں ایک ذرہ ہے جسے پروٹان کا نام دیا گیا ہے اور اس کے گرد صرف ایک الیکٹرون گردش کرتا ہے۔ پروٹان الیکٹرون سے ۱۸۴۳ گنا بھاری ہوتا ہے۔ اسی دوران ایک اور نامور سائنسدان چیڈوک نے ایٹم کے مرکز میں ایک اور ذرے کا کھوج لگایا ہے جسے نیوٹران کا نام دیا گیا ہائیڈروجن ایٹم کے علاوہ یہ ذرہ ہر ایٹم کے مرکز میں ہوتا ہے اس پر بجلی کا نہ مثبت چارج ہوتا ہے نہ منفی اور وزن میں پروٹان کے برابر ہوتا ہے۔ ایٹم کے مرکز میں پروٹان اور نیوٹران کی تعداد عام طور پر مساوی ہوتی ہے گویا تمام عناصر ایک ہی قسم کے ذرات سے بنے ہیں صرف تعداد کا فرق ہے۔ پارے اور سونے میں صرف چند پروٹان اور نیوٹران ذرات کا فرق ہے جیسے اینٹ سے ہم کوٹھی بھی بناتے ہیں اور اسی سے عالی شان محل مگر دونوں ہی کو ترشہ اس چھوٹی سی اینٹ کا ہو بہو یہی کیفیت خاص کی ہے۔ کثرت میں وحدت کی یہ ظاہر مثال ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ فطرت ہائیڈروجن کے ایٹم سے نئے عناصر کیسے تخلیق کرتی ہے پہلے بیان ہو چکا کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے مرکز میں صرف ایک پروٹان ہوتا ہے۔ اگر اس مرکز میں ایک نیوٹران بھی داخل کر دیا جائے تو ہائیڈروجن کی ایک نئی قسم بن جاتی ہے جسے سائنس کی اصطلاح میں ڈیوٹیریم یا بھاری ہائیڈروجن کہا جاتا ہے کیمبرج یونیورسٹی کی اس ٹیم کے شہرۂ آفاق سائنسدان ایف ڈبلیو ایسٹن نے انکشاف کیا کہ تمام عناصر کے ایک یا ایک سے زائد جوڑے بھی ہوتے ہیں انہیں آئسوٹوپ کا لقب دیا گیا۔ ہم حیوانات اور نباتات میں جوڑوں کے وجود سے قوآشنا تھے سائنس نے یہ ایک نیا گل کھلایا کہ جمادات میں بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں وضاحت ہے کہ من کل شیئ خلقنا زوجین۔ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ اس بھاری ہائیڈروجن کو عام ہائیڈروجن کا جوڑا سمجھ لیجئے۔ جب عام آکسیجن سے مرکب کر دی جائے تو بھاری پانی بن جاتا ہے جو ایٹمی توانائی

کے ری ایکٹروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عام پانی میں اس کی مقدار بہت قلیل یعنی ۰۲ فی صد ہوتی ہے اور اسے بجلی کے ایک خاص عمل سے علیٰحدہ کر لیا جاتا ہے۔

اس طرح دو پروٹان اور دو نیوٹران مرکز میں ہوں اور دو الیکٹرون ان کے گرد گردش کریں تو ہیلیم گیس بن جاتی ہے یہ عنصر ہمارے کرۂ ہوائی میں بھی ہے اور سورج کی سطح میں کھربوں ٹن کے حساب سے موجود ہے اور نام کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ ہائیڈروجن گیس سورج میں جل کر ہیلیم بنتی ہے۔ اس عمل میں کچھ مادہ فنا ہو کر توانائی میں تبدیل ہوتا ہے اور سورج کی تمازت کا یہی راز ہے۔ ہائیڈروجن بم بھی اسی عمل سے تیار ہوتا ہے۔

دو اصطلاحیں بھی وضع کی گئیں جو ایٹمی سائنس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ ایک ایٹمی وزن ہائیڈروجن کے ایٹم کو اکائی مان کر دوسرے عناصر کا دوسرے عناصر کا ایٹمی وزن نکالا جاتا ہے اس طرح ایٹم کے مرکز میں جتنے پروٹان ہوتے ہیں اسے ایٹمی نمبر کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ہائیڈروجن کا ایٹمی وزن ایک اور ایٹمی نمبر بھی ایک ہے۔ یورانیم دھات کا ایٹمی نمبر ۹۲ ایٹمی وزن ۲۳۸ ہے۔ اس کا ایک آئسوٹوپ بھی ہوتا ہے جس کا ذکر آئے گا جس کا ایٹمی وزن ۱۹۶۔ اور پارے کا ۲۰۰ ہے اب اگر سونے کے ایٹم کے مرکز میں دو پروٹانوں اور دو نیوٹرانوں کا اضافہ کر دیا جائے تو پارہ بن جائے گا اور اس طرح اگر پارے کے ایٹم کے مرکز سے دو پروٹان اور دو نیوٹران نکال دئے جائیں تو یہ سونا بن جائے گا۔ ہر پروٹان نکالنے کے ساتھ ایک الیکٹرون بھی نکالنا پڑے گا تاکہ ایٹم کا توازن برقرار رہے سائنس دانوں نے . . . . حقیقت میں اپنے طریقے سے پارے سے سونا بنایا بھی ہے مگر اس عمل پر خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قدیم کیمیا گروں کا یہ خیال کہ ادنیٰ دھاتوں سے سونا بنایا جائے، ایک سائنسی حقیقت اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی طریقہ سامنے نہیں آیا مگر ذرا سی دوائی سے سیروں چاندی سونا بنایا جا سکے۔

مخدوم سجاد حسین قریشی کے والد گرامی نواب سر برید حسین مرحوم نے مجھے ایک عینکی دوا دی تھی جس کی مدد سے پارہ چاندی میں تبدیل ہو گیا تھا اور ایک تولہ وزن کا یہ ڈلہ ہو کر اتنے ہلکے عناصر میں تبدیل ہو جاتی ہے مگر ان کا مجموعی ایٹمی وزن ۲۳۵ کے برابر نہیں ہوتا باقی مادہ مذکورہ بالا مساوات کے مطابق حرارت روشنی اور تیز و تند شعاعوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا اور جرمن سائنسدانوں پر یہ امر واضح ہو گیا کہ اس عمل سے ایٹم بم بنانا کچھ مشکل نہیں۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچا دی کہ جنگ یورینیم میں یورانیم ۲۳۵ کا تناسب ایک حد سے زیادہ نہ ہو جائے یعنی ۰،۷ فیصد سے ۰،۹ فیصد تک اس وقت تک اسے بم کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا اور ایک خاص مقدار اور ایک خاص شکل بھی اس امر کے لئے ضروری ہے اس خاص مقدار کو سائنس کی اصطلاح میں CRITICAL MASS کہتے ہیں جتنی اس مقدار سے زائد تا بکار یورانیم موجود نہ ہو نیوٹران کی شعاع سے یہ بم کی طرح پھٹ نہ سکے گی بلکہ حرارت پیدا کر کے اڑ جاتے ہیں۔ حرارت اتنی تیز ہوتی ہے کہ لوہا اور فولاد دھواں بن کر اڑ جاتے ہیں۔ مٹی، ملبہ، پانی کے بخارات انسانی اور حیوانی لاشیں بناتات غرض کہ اس بدنصیب علاقہ کی تمام موجودات ایک زبردست زلزلہ اور جہنمی آگ کی تپش سے بگولہ بن کر آسمان کی طرف ۵۰۔۴۰ ہزار فٹ تک کھمبی کی شکل کے ایک بادل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

لاکھوں کی آبادی میں ہیروشیما میں صرف چند نفوس بچے جن میں سے کئی ایک ابھی تک ہسپتالوں میں سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ ہیروشیما کے بعد دوسرا بم ناگاساکی پر گرایا گیا اور جاپان کی فوجی حکومت نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد روس، برطانیہ، فرانس اور بالآخر چین نے بھی ایٹم بم بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی۔ ۱۹۷۴ء میں بھارت نے بھی ایٹمی دھماکہ کیا امریکہ اور دیگر ممالک نے ایٹم بم میں استعمال ہونے والے مادہ اور بھارتی ہائیڈروجن گیس کی مدد سے ہائیڈروجن بم بھی بنا لیا اس بم میں ہائیڈروجن انتہائی تیز حرارت سے ہیلیم گیس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دیگر ہلکے عناصر بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ مادہ فنا ہو کر حرارت اور طاقت میں تبدیل ہو جاتا ہے یہ قوت ایٹم بم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ سورج کی تمازت اور توانائی کا راز بھی یہی عمل ہے مگر ابھی تک انسان ہائیڈروجن بم کی توانائی کو استعمال میں نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مخدوم صاحب موصوف کی تحویل میں کچھ عرصہ رہا پھر گم ہو گیا۔ راقم نے اسے ہزار اعتبار سے لیبارٹری میں پرکھا خالص چاندی تھی خدا معلوم یہ حقیقت تھی یا ہاتھ کی صفائی۔ یہ عمل سب میرے سامنے ہوا۔ مخدوم صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ایٹمی توانائی کا راز نہ ہی ایٹمی شکست و ریخت ہے۔ لارڈ ردر فورڈ نے یہ تو ثابت کر دیا کہ ایٹم میں فلاں فلاں اجزاء ہیں مگر ایٹم کے اندرون کو چیرنا دشوار نظر آیا۔ بعد میں اس مقصد کے لئے نیوٹران کی شعاع ایجاد کر لی گئی اور بالآخر ۱۹۳۶ء میں جرمن سائنسداں ڈاکٹر آٹوہان پہلی بار یورانیم کے ایٹم کو پھاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ انسان کی زبردست کامیابی تھی اور ایک عظیم پیش خیمہ۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ صرف یورانیم کا آئسوٹوپ جس کا ایٹمی وزن ۲۳۵ ہے ان شعاعوں کی مدد پھٹتا ہے جس کا تناسب عام یورانیم میں صرف ۷ء۰ فی صد ہوتا ہے۔ جب یورانیم ۲۳۵ پھٹتی ہے تو ایک نیوٹران جو اس کے ایٹمی مرکز کے اندر گھستا ہے، مرکز سے دو نیوٹران نکال باہر کرتا ہے اور یہ نیوٹران مزید ایٹم کو پھاڑتے ہیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے تاآنکہ ساری یورانیم کی مقدار متاثر ہوتی ہے اسے سائنس کی اصطلاح میں CHAIN REACTION کہتے ہیں۔

یورانیم ۲۳۸۔ اس عمل سے نہیں پھٹتی۔ آپ سوال کریں گے کہ یورانیم ۲۳۵ کے پھٹنے سے توانائی کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے میں اس زمانہ کے مشہور عالم سائنسداں پروفیسر آئن سٹائن جو ہٹلر کے زمانہ میں جرمنی سے نقل وطن کر کے امریکی شہریت اختیار کر کے وہیں آباد ہو گئے اور یہودی النسل تھے کے نظریہ اضافیت کی طرف لے چلتا ہوں۔ یہ نظریہ کئی باتوں پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مادہ اور طاقت اصل میں ایک ہیں اور حسابی شکل میں ایک مساوات کے ذریعے اس ربط کو دنیا کے سامنے رکھا گیا۔ $E=mc^2$ یہ اس زمانہ کی مشہور عالم مساوات خیال کی جاتی ہے جس نے انسان کے ذہن کو نئے افق عطا کئے ہیں۔ E سے مراد طاقت m سے مراد مادہ اور c سے مراد روشنی کی رفتار ہے۔ گویا تھوڑے سے مادے سے بے پناہ طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یورانیم کا ایٹم جب پھٹتا ہے تو یورانیم تحلیل

یادوں کے چراغ

ندویانہ زندگی کے چند روشن اوراق

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

میں ندوہ میں درجۂ عالمیت میں داخل ہوا تھا، ہدایہ درس میں تھی کلاس میں بیٹھتا تھا مگر کچھ سمجھتا نہیں تھا، مولانا اسباط صاحبؒ ہدایہ پڑھاتے تھے اور ان کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ طالب علم نے ایک جملہ پڑھا نہیں کہ مولانا نے زبانی پوری عبارت خود پڑھ دی اور تشریح کر دی۔

ہمارے قریب ہی مولوی وجیہ الدین بیٹھتے تھے اور نہایت خاموشی سے خود سے گفتگو نہیں کرتے تھے چہرے سے سنجیدگی اور علمیت کا اظہار ہوتا تھا، میں نے ایک دن سوچا کہ کیوں نہ ان سے کہوں کہ کسی وقت ہدایہ مجھے بھی سمجھا دیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت میری عمر ۱۳-۱۴ برس کی رہی ہوگی۔ وجیہ الدین صاحب سے جب میں نے درخواست کی تو انہوں نے خوشی سے منظور کر لی اور بولے کہ ظہر کے بعد کمرہ پر آجایا کیجئے تو روزانہ میں ہدایہ کے اسباق سمجھا دیا کروں گا چنانچہ کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر میں خود ہی سمجھنے لگا تو جانا ترک کر دیا مگر محبت و خلوص کا تعلق آخر تک باقی رہا۔

مولوی وجیہ الدین نے علمی محنت بہت کی عام مطالعہ کے لئے کتابوں کے جو چارٹ مختلف جماعتوں کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے لاصلاح میں لگوائے تھے وہ ان کے مطابق مطالعہ کرتے تھے۔ اس لئے صلاحیت بڑی پختہ تھی معلومات وسیع تھیں اور نحو صرف کے مسائل پر اچھی قدرت حاصل تھی مگر زبان مقفیٰ و مسجع لکھتے تھے۔ چنانچہ ایک بار مولانا محمد رابع ندوی مدظلہ کے سامنے ایک مقالہ پیش کیا مولانا نے اصلاح شروع کی پھر فرمایا کہ یہ زبان مناسب ہے اور عصری تقاضا پوری نہیں کرتی۔ انہوں نے سادی اور غیر مقفیٰ زبان لکھنے کی تلقین کی۔

ہم لوگ درجۂ فضیلت میں تھے کہ وجیہ الدین صاحب کو دماغی عارضہ پیش آیا اور اس شدید محنت کے آثار ظاہر ہونے ہونے کرتے تھے۔ بڑا افسوس ہوا۔ ان کو حکیم شمس الدین کے پاس لے جایا گیا دارالعلوم ہی میں ایک مکان میں کچھ دن وہ رکھے گئے جنون کے اثرات واضح تھے۔ چونکہ مجھے خصوصی تعلق تھا ایک شام کو ان سے ملنے گیا دیکھتے ہی میری طرف مجنونانہ انداز میں اس طرح لپکے کہ میں بھاگا اور وہ میرے پیچھے دوڑے اس کے بعد میں پھر ملنے نہ گیا۔ خیر اللہ نے رحم فرمایا کہ طبیعت معمول پر آگئی مگر یہ مرض ایسا ہے کہ اثرات باقی رہ جاتے ہیں اس لئے عربی میں کہا گیا ہے کہ "من جُنَّ جن ابداً"۔

مرحوم کو استاد گرامی مولانا اسحٰق سندیلوی ندوی مدظلہ العالی سے خاص تعلق تھا۔ وہ مولانا کے گھر کے قریب ایک گاؤں ابھی جگت پور کے رہنے والے تھے مولانا اسحٰق صاحب کی کوششوں سے وہ ندوہ میں داخل ہوئے اکثر مولانا کے ساتھ وطن جاتے اور واپس آتے۔ مولانا بھی ان کی تعریف کرتے اور ان کی صلاحیت اور سعادت مندی سے خوش ہوتے۔

وجیہ الدین صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے معمولات کے بڑے پابند۔ صبح کو نماز بعد مولانا اسحٰق صاحب کی نگرانی میں ورزش کرتے مگر وہ اکثر اپنی ورزش الگ کرتے اور کسی آم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر مختلف طرز کی ورزشیں کرتے۔ ایک دن مولانا اسحٰق صاحب نے ان کو بلا کر ان سے فرمایا کہ درخت کے نیچے ورزش مت کیجئے اس لئے کہ کھلی فضا میں ہوا بہتر ہے درختوں سے گیس نکلتی ہے جب سے وہ کھلی ہوا میں ورزش کرنے لگے پابندی اوقات اور ورزش کے باوجود ان کی صحت کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ محض تقدیر الٰہی ہے جس میں کسی تدبیر کو دخل نہیں۔

دماغی مرض کے بعد پھر درحقیقت انکی شخصیت بدل گئی۔ بعد میں دارالعلوم میں مدرس بھی رہے مگر وہ بلند توقعات جو ان کی ذات سے علمی حیثیت سے وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ استاذ محترم مولانا محمد رابع ندوی صاحب نے ایک بار فرمایا کہ ان کو اونچے درجات کی تعلیم سپرد اس بنا پر نہیں کی جاتی کہ ان پر زیادہ ذہنی کام کا بوجھ نہ پڑے اس لئے ہلکے کلاسز ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ندوہ کے عظیم جشن میں ان سے دلچسپ ملاقاتیں رہیں۔ ہم چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل چائے پینے پہنچے کہ وہاں مولانا وجیہ الدین مل گئے۔ لپک کر لے مصافحہ اور معانقہ ہوا میں نے ان کو ان کے ساتھیوں سے چھڑا دیا اور درخواست کی کہ چائے ہمارے ساتھ پیجئے۔ بولے اس جگہ کھلا دو حکم کی تعمیل کی مگر انہوں نے ایک دوسرا مسئلہ چھیڑ دیا، فرمایا کہ اقتحام تمہارا کیا خیال ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ہر جنتی کو ۷۰ ہزار حوریں عطا ہوں گی تو کیا ہوگا؟ میں نے کہا حضرت ان مسائل میں نہ الجھئے اس دنیا میں اسلام پر عمل کے مسائل پر غور کرنا چاہئے، میرے ساتھ میرے دو عزیز تھے جمال صاحب اور کمال صاحب (انہیں کے والد نے ندوہ کی مسجد کا نقشہ بنایا تھا جیسا کہ انہوں نے بتایا وہ انجینیر تھے) ان سے ذکر نکلا کہ ہم لوگوں کے ایک دوسرے عزیز کا جو عمر کے آخری مرحلہ میں تھے ان کو پولیس والے جماعت اسلامی کے تعلق کی بنا پر جیل اٹھا لے گئے اس پر وجیہ الدین صاحب نے فرمایا کہ لیجئے یہ دور سیدیں ہیں ایک ایک روپیہ کی جب وہ چھٹ کر آئیں تو دو دو روپے دیدیجئے گا ایک دینی مدرسہ کو نفع پہونچے گا ان دونوں نے اسی وقت دو روپے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کیے، میں نے دل میں کہا کہ "دیوانہ بکار خویش ہشیار"۔ نے دوسرے دن مسجد کے قریب ہمان جا کے سامنے وہ شیروانی میں ملبوس کھڑے تھے بڑی خوشدلی اور پرجوش انداز سے گفتگو کر رہے تھے مجھے تعجب ہوا کہ ان کی طبیعت کیسی بدل گئی، گفتگو میں اشعار، فصیح جملے گویا کہ گھڑے چمک رہے تھے، مجھ کو دیکھتے ہی بولے اصغشام تم نے شادی کر لی اور ولیمہ میں بھی نہیں بلایا، میں نے کہا کہ ارے بھائی اتنا زمانہ گذر گیا اب کیا شکایت۔ بولے شکایت تو باقی رہیگی، میں نے بعد میں سنا کہ انہوں نے جس ہی کے دوران اذان کی آواز سنی اور بولے کہ میں بھی اذان دوں گا۔ اسٹیج پر آگئے اور دوبارہ اذان دینی شروع کر دی۔

ذہن میں ندوہ کے ساتھ ان کا ذکر وابستہ رہا اور اب جبکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ایک شریف انسان اور دیندار دوست کی یاد آتی ہے۔

وجیہ الدین صاحب نہایت پاکیزہ زندگی گذارتے تھے ہم لوگ تو داڑھی پر کچھ نہ کچھ ہاتھ صاف کرتے تھے مگر وہ مشکل و صورت اور لباس میں پوری طرح اسلامی ہیئت میں رہتے تھے۔ شرعی پائجامہ، کرتا اور ٹوپی عام لباس یہی تھا مگر کبھی کبھی شیروانی بھی پہنتے تھے۔

اس زمانہ میں ندوہ کی درسگاہ کی عمارت میں دونوں کناروں کے مینار غیر مکمل تھے ہم لوگ اکثر اس پر چڑھ جاتے اور وہاں بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ عبداللہ زبیر مرحوم (ابن مولانا قاری منیر صاحب) محمد ایوب بستوی، مسیحا (سیع الدین پھلواروی) اور وجیہ الدین صاحب کی اکثر بزم جمتی۔ ایک بار چند طلبہ نے ایک استاد کی شکایت مفتی سعید صاحبؒ سے کر دی وہ اس زمانہ میں مہتمم تھے۔ مفتی صاحب کلاس میں تشریف لائے اور پوچھا کہ نقوی کا مادہ کیا ہے اور کیسے بنا ہے؟ ہم لوگ خاموش ہو گئے۔ مفتی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ آپ کا حاصل تو یہ ہے پھر "تمت دھند استاذ را" کہہ کر چلے گئے۔ بعد میں وجیہ الدین صاحب کی خاموشی پر تعجب ہوا وہ جانتے تھے مگر بولے کم تھے۔ بعد میں میرے استفسار پر بتایا،

درجۂ عالمیت کے ساتھیوں میں سے اب دو ملک عدم کے باسی ہیں۔ اللہ اللہ کیسی کیسی صورتیں دوستوں کی افق خیال میں ابھرتی ہیں ان میں سے اکثر کے پتے تک نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اس سال حج سے مشرف ہونیوالے

مکہ معظمہ اس سال تقریباً ۴۰ لاکھ زائرین کرام نے حج کا فریضہ ادا کیا ان میں ۸ لاکھ ۶۲ ہزار ۵۲۰ حجاج باہر کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں ان کی تعداد میں ۳۲ ہزار ۴۸۴ کا اضافہ ہوا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ میں بیرونی حجاج کی تعداد اب کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

مختلف ممالک کے حاجیوں کی تعداد یہ ہے۔

عراق ۹۹۴۷۰ (۲۰۸۲ کا اضافہ) ایران ۷۹۶۳ (۲۶۹۵ کا اضافہ) پاکستان ۴۲۹۶۷ (۲۳۷۲ کا اضافہ) صومالیہ ۱۲۹۳۴ (۵۱۵ کا اضافہ) مصر ۴۸۲۹۷ (۴۴۶۹ کا اضافہ) شام ۷۱۹۶۹ (۵۸۳۱ کا اضافہ) فلسطین ۱۷۵۹ (۵۲۶۷ کا اضافہ) ہندوستان ۲۴۸۶۳ (۴۶۳۰ کا اضافہ) اس میں بیرونی ملکوں کے ہندوستانی بھی شامل ہیں) لبنان ۱۰۶۸ (۴۰۳ کا اضافہ) لائبیریا ۹۵۱ (۲۷۵۵ کا اضافہ بنیا ۳۵۳۴ (۲۴۳۲ کا اضافہ) سوڈان ۱۹۰۹۹ (۲۳۹۱ کا اضافہ) عرب ری پبلک یمن ۸۹۸۹ (۲۳۹۵ کی کمی) انڈونیشیا ۴۳۷۲۳ (۲۸۸۰۴ کی کمی) ترکی ۵۱۷۷ (۴۷۹۲ کی کمی) افغانستان ۹۹۰ (۲۷۵۱ کی کمی) پیپلز ڈیموکریٹک ری پبلک آف یمن (۱۴۷۰ (۲۹۸۰ کا اضافہ) الجزائر ۲۷۱۱۵ (۴۷۸۴ کی کمی) نائیجیریا ۲۰۰۸ (۲۴۹۳ کی کمی نائیجیریا کے حاجیوں کی تعداد بھی نسبتاً کم آئی۔

بقیہ صفحہ ۱۰

لاسکا۔ گو اس عمل پر بے حد و حساب تحقیق کا کام جاری ہے اور توقع ہے کہ انسان اس پر بھی قابو پالے گا۔ یہ طاقتور بم بنالینے کے بعد اقوام عالم نے ہم کو دور دراز ٹھکانوں پر صحیح نشانہ باندھ کر گرانے کے طریقے ایجاد کئے اور ایسے میزائل تیار کر لئے ہیں جو آن واحد میں دوسرے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔ بم کی قوت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک پیمانہ وضع کیا گیا ہے۔ عام پھٹنے والے بم میں جو آتش گیر مادہ استعمال ہوتا ہے اسے مخفف طور پر T.N.T. کہتے ہیں یہ ایک کیمیاوی مرکب ہے، ابتدائی ایٹم بم بیس ہزار T.N.T. کی قوت کے برابر تھا جس سے ہیروشیما اور ناگاساکی دو شہر صفحۂ ہستی سے دیکھتے دیکھتے مٹا دیے گئے۔ دس لاکھ ٹن T.N.T. کی قوت کے برابر کو ایک میگاٹن ہم کہتے ہیں اور اس وقت روس اور امریکہ کے پاس ۱۰۰ میگاٹن طاقت کے بم سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں ایٹم یا ہائیڈروجن بم پھٹنے سے مقامی تباہی کے علاوہ جو گرمی مربع میل کو محیط ہوتی ہے۔ نیوٹران درات جو ہر ایٹم کے اندر گھس جانے کی قابلیت رکھتے ہیں ہوا، مٹی غرضیکہ ہر چیز کو وقتی طور پر ناکارہ بنا دیتے ہیں اور ان میں سے ایسی ہلاکت انگیز شعاعیں نکلتی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ اثر کرہ ہوائی کی مدد سے ہزاروں مربع میل تک چلا جاتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی قوت تولید بچوں اور پودوں کی قوت رویدگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ پورا عالم انسانیت حیوانات و نباتات پانی اور خوراک کے ذخائر پوری تہذیب و تمدن انسانی زبردست خطرات کی زد میں ہے یہ بم یورپ اور امریکہ کی سفید فام اقوام کی کوشش کا نتیجہ ہے اور نسل انسانی کو مٹا دینے کا یہ ہتھیار سیاست افرنگ کا مرہون منت ہے جس کی ترجمانی اقبال نے یوں کی ہے ؎

خداوندے کہ در طوف حریمش
صد ابلیس است و یک اورج الدین نیست

بقیہ صفحہ ۱۱

معلوم، ندوہ، جامعہ اور علی گڑھ کی طالبعلمی میں کتنے دوست ساتھ رہے مگر اب جنوبی ہند کے اس گوشہ میں تنہا ہوں۔ وجیہ الدین صاحب سے کبھی کبھی خط و کتابت دور طالبعلمی میں ہوتی تھی انہوں نے پہلے ہی خط میں حماسہ کا ایک شعر نقل کیا تھا آج وہی شعر ہمارے جذبات کی ان کے بارے میں ترجمانی کرتا ہے ؎

اذا زرت ارضاً بعد طول اجتنابها
نقدت صدیقی والبلاد کما هی

(جب میں کسی جگہ بہت دنوں کے بعد جاتا ہوں تو دوست کو کھو دیتا ہوں تو دوست کو کھو دیتا ہوں اور شہر ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ تھا)۔

لکھنؤ تو ویسا ہی ہے مگر وجیہ الدین صاحب وہاں نہ رہے۔

نعت سرورِ کائنات

سکندر ضمیر

سرشار ہے دل اپنائے حُبِّ نبی سے
ساقی مجھے کیا خوف ہو پھر تشنہ لبی سے

قسمت سے جو پہنچوں گا کبھی انکی گلی میں
جا کر کبھی لوٹوں گا نہ پھر ان کی گلی سے

ہونے کے لئے ہونگے بڑے کتنے جہاں میں
لیکن ہے بڑا کون رسول عربی سے

رضواں کو بہت ناز ہے فردوس پہ اپنے
فردوس کو نسبت نہیں طیبہ کی گلی سے

کیا جانئے کیا حال ہو جب پہنچوں گا طیبہ
بے تاب ہے دل سینے میں جب اپنا ابھی ہے

جانا جو صبا طیبہ تو کہنا مری حالت
مکّی مدنی، ہاشمی و مطلبی سے

اک نورِ مجسّم کا تصوّر ہے مرے ساتھ
اب خوف مجھے کوئی نہیں تیرہ شبی سے

کیا ڈر ہو اُسے روزِ جزا، یومِ سزا کا
ہو جائے جسے عشق رسولِ عربیؐ سے

پوچھیں گے نکیرین جو کیا دین ہے تیرا
کہہ دوں گا مجھے عشق ہے طیبہ کے دھنی سے

کیا اس کو جلائے گی بھلا نارِ جہنم
ہو دل سے جسے عشق رسول عربیؐ سے

جب ساقیِ کوثر ہیں مرے میں بھی ہوں اُنکا
پھر کیوں مجھے نسبت ہو کوئی تشنہ لبی سے

جو سرورِ عالم کی محبّت سے ہو سرشار
کیوں دل وہ لگائے گا ضمیرؔ اور کسی سے

(۲۹) ویں رحمۃ للعالمین صلعم تحریری مقابلے

حیدر آباد ——— کُل ہند مجلس تعمیر ملت کے پریس نوٹ کے بموجب حسب سابقہ گذشتہ اس سال بھی (۲۹) ویں یوم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر کُل ہند بنیادوں پر تحریری مقابلے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ اس سال کے لئے عنوانات۔ ڈگری کالج کے طلباء کے لئے "حفاظت خود اختیاری اور سیرت طیبہ" یا "عالم اسلام کے جدید رجحانات"۔ دینی مدارس گروپ کے لئے "ہدایت کے لئے ایمان بالغیب کیوں ضروری ہے"۔ انٹرمیڈیٹ میڈیٹ گروپ کے طلباء کے لئے اقبال کی نظموں "شکوہ اور جواب شکوہ کا مطالعہ"۔ اور ہائی اسکول کے طلباء کے لئے "عقائد اسلام" تجویز کئے گئے ہیں۔

ڈگری کالج گروپ میں انعام اول -/150 روپے اور انعام دوم -/125 روپے
دینی مدارس گروپ کے لئے انعام اول -/150 روپے اور انعام دوم -/125 روپے
انٹرمیڈیٹ گروپ کے لئے انعام اول -/125 روپے اور انعام دوم -/100 روپے
وہائی اسکول گروپ کے لئے انعام اول -/100 روپے اور انعام دوم -/75 روپے

کے علاوہ

ہر گروپ میں ترغیبی انعامات بشکل کتب بھی دیے جائیں گے۔

مضامین اردو یا انگریزی زبان میں لکھے جا سکتے ہیں، جو فل اسکیپ سائز کے کاغذ کے ایک ہی رُخ پر لکھے جائیں۔ کالج اور دینی مدارس گروپ کے طلباء زیادہ سے زیادہ (۴۰) صفحات پر اور انٹرمیڈیٹ کے طلبا (۳۵) صفحات اور ہائی اسکول کے طلباء (۲۰) صفحات پر اپنے مضامین روانہ کر سکتے ہیں۔

داخلہ فیس برائے دینی مدارس و کالج گروپ کے طلباء کے لئے ۴ روپے، انٹرمیڈیٹ گروپ و ہائی اسکول گروپ کے طلباء کے لئے ۳ روپے ہے جو بذریعہ منی آرڈر درج ذیل پتہ پر مضامین کے ساتھ روانہ کی جائے۔

ان مقابلوں میں مضامین داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ دسمبر ۵۹ء مقرر کی گئی ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے جناب سید تسیم معتمد تحریری مقابلہ۔ صدر دفتر کُل ہند مجلس تعمیر ملت، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۲۹ سے ربط پیدا کریں۔

قیوم عادل
(معتمد نشر و اشاعت)

ضروری گذارش!

خط و کتابت یا منی آرڈر ارسال کرتے وقت نام و پتہ صاف تحریر کریں نیز خریداری نمبر بھی لکھنا نہ بھولیں۔ اکثر منی آرڈر کوپن بغیر پتہ اور حوالے کے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دفتر کو زحمت ہوتی ہے اور آپ کو پرچہ بروقت نہیں پہونچ پاتا ہے۔

(منیجر)

ناتہ دبالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب دین سودائے خام

لا الٰہ سے یہی سبق ملتا ہے کہ انسان دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت و حکومت کو مٹا کر حکومت الٰہی قائم کرے۔ فرماتے ہیں ؎

صنم کدہ جہاں اور مردِ حق ہے خلیل، یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

اقبال کو معلوم ہے صدیاں گذر چکیں کہ مسلمان اس چیز کو فراموش کر چکا ہے کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک کا علمبردار ہے اور دنیا کے فتنہ پرور اور ظالمانہ نظاموں کو مٹا کر ان کے بجائے امن و سلامتی اور مساوات کا عملی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے اور یہی لا الٰہ کا مقصود حقیقی ہے۔ اقبال اسی عقیدہ کے ذریعہ سے انسان کو بتانا چاہتے ہیں کہ خدا انہیں کی مدد کرتا ہے کہ جو دست سوال نہیں بلکہ دست طلب پڑھائیں۔ سروری اور جہانبانی انہیں کے لئے ہے جو جد و جہد اور سعی مسلسل سے کام لے کر برابر منزل کی طرف بڑھتے رہیں، ہر ہر طرح کی قربانی اور ایثار کرنا اور پہاڑوں سے ٹکرانا جانتے ہیں ؎

حدیث بے خبراں ہے زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اقبال — چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی، اس نوائے عافیت کوش کے ہمنوا نہیں اس لئے کہ وہ درد انگیز الفاظ میں تنبیہ فرماتے ہیں ؎

مثالی از مقام کبریائی — حضورِ دوں نہادان، سرنہادی
بجو دے آدری دارا و را — مکن اے بے خبر رسوا حرم را

مومن کا کردار یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خدا کے سوا کسی محتاج الیہ نہ بنائے چنانچہ اقبال فرماتے ہیں ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی — کوئی بتائے کہ پھر اور کافری کیا ہے
مسلم استی بے نیاز ہر غیر شو — اہل عالم را سراپا خیر شو
پیش منعم شکوۂ گردوں مکن — دست خویش از آستیں بیروں مکن

جب وہ ظاہری عابدوں اور زاہدان خشک میں بھی نگاہ مرد مومن اور عزم مسلم نہیں پاتے ہیں تو ان سے بھی بیزار ہو کر فرماتے ہیں ؎

نہ با صوفی نہ با ملا نشینم — تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نوشت اللہ بر لوحِ دل من — کہ خود را ہم بہ ہر سو فاش بینم

جو لوگ ایسے لوگوں کے چنگل میں پھنس کر عزم و عمل کو کھو بیٹھتے ہیں اُن کو اس طرح تلقین کرتے ہیں ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں

اقبال شاعر دیدہ ور تھے پوری قوم کو اپنے مقام سے گرا ہوا دیکھ کر بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اس میں حوصلہ آفرینی کے لئے فرماتے ہیں ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اسی لئے اقبال راہی کم کوش کو بسا غنیمت سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

غرض اقبال کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر کو کتابوں میں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مومن کی زندگی کو اس کی تفسیر ہونا چاہیئے اُسے اپنے طرز عمل سے عامۃ الناس کو آگاہ کرنا چاہیئے کہ اس کلمہ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ عصر حاضر کے شعلہ بار فتنوں میں صحیح و سلامت رہنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ کا سا ایمان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن

پرنٹر، پبلشر، ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دھلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

مرتبہ: شمس الحق ندوی
محمود الازہر ندوی

ہماری دولت مگراہی پھیلا رہی ہے

مولانا عبدالملک جامعی مدنی

ہندوستان میں ایک والی ریاست تھے، نیا میں اس وقت سب سے زیادہ دولتمند بھلاتے تھے، اب سے ۵۰ برس پہلے سات ارب ان کے مدفون خزانے کا اندازہ تھا آج کی قیمت بیس گنی سے ہرگز کم نہیں۔ اسی طرح ایک کھرب چالیس ارب روپیہ بنتا ہے (اس میں شک نہیں کہ انہوں نے راہ خدا اور منافع للناس میں بھی بہت خرچ کیا مگر جھوٹا تھا اس کو اس سے کوئی نسبت نہیں) ہمارا ایمان ہے کہ ایک ایمان دار آدمی ساری دنیا کے بے ایمان انسانوں سے زیادہ قیمتی ہے جن سے دنیا بھری ہوئی ہے، اس لئے ایک کھرب چالیس ارب روپیہ خرچ کر کے بھی اگر ایک اور صرف ایک آدمی دوزخ سے آزاد کرایا جاتا تو سودا نقصان کا نہیں نفع کا تھا اور اگر وہ چاہتے تو لاکھوں انسانوں کی گردنیں اس دولت کے ذریعہ جہنم سے بری ہو سکتی تھیں بلکہ شاید کروڑوں۔ مگر ایسا نہیں ہوا، مدفون خزانے مدفون ہی رہے، عذاب نازل ہوا اور یہ سارا روپیہ جنت والوں کو جہنم کی راہ دکھانے میں لگا دیا گیا۔

ایک دیہاتی آدمی تھے عبدالکریم، دس من چاندی تھی اور پانچ من سونا، اس سے کتنے ہزار آدمی جہنم سے آزاد ہو سکتے تھے، اس بات کی فکر نہیں کی، یہ سارا روپیہ بھی نواب صاحب کے روپیہ کی طرح جہنم کی دعوت دینے میں لگا دیا گیا، جائیں الگ مصائب ہوئیں اور مال الگ گیا۔

ہندوستان میں کام کو مختلف لوگوں نے کیا، خواجہ حسن نظامی صاحب بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے، کنور عبدالوہاب صاحب کی انجمن بھی ہاتھ پاؤں مارتی رہی مگر میں نے کامیاب ادارہ مالابار کے علاقہ پنہاآنی دکالی کٹ) میں دیکھا تقسیم سے پہلے کوئی ۴۰ ہزار کی گردنیں آزاد کرا چکے تھے، اور یہ غریب اور متوسط لوگوں کی انجمن تھی، ورنہ کلکتہ، دہلی، بمبئی، الہ آباد، لکھنؤ، رنگون ہر جگہ لکھ پتی مسلمان تھے بلکہ تجارتیں بھی گئیں بلکہ بعض جگہ تو بالکل ہی تباہ و برباد ہو گئیں۔ جان ہی کے نہیں، مال کے لالے پڑ گئے، رنگونی مسلمان کروڑ پتیوں کا شہر تھا آج لوگ کوڑی کوڑی کو محتاج ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

کروڑ پتی یہ مسلمانوں کے تجارتی مرکز تھے بلکہ اس کے آگے بینگ کاک اور سیگاؤں بھی، سنگاپور اور ملایا بھی، جاوا میں کئی ہندوستانی کروڑ پتی تھی، ان دولت مندوں نے اس جانب توجہ نہیں کی، بالآخر دولتیں بھی گئیں

تعمیر حیات
کی
اشاعتِ خاص

- مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ
- مولانا سیّد محمد الحسنیؒ
- مولانا اسحاق جلیس ندویؒ

کے حالات، واقعات، علمی و ادبی خدمات، خصوصیات و کمالات اور کارناموں پر مشتمل ہوگا۔ اس میں ہند اور بیرون ہند کی ممتاز علمی شخصیتوں کے تعزیتی خطوط کے عکس، علمی، ادبی، بین الاقوامی تنظیموں کی تعزیتی قراردادیں، اخبارات و رسائل کے تعزیتی نوٹ، نیز مرحومین پر حضرت مولانا کے علیحدہ علیحدہ مفصّل مضمون، علمی کارناموں کی تفصیلات اور اہل تعلق کے قابل قدر مضامین شامل ہیں۔ یہ شمارہ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ہم انشاء اللہ اس کو آخر دسمبر تک نذر قارئین کریں گے۔

ایجنٹ حضرات، نیز بخی طور پر خواہشمند افراد کاپیوں کی مطلوبہ تعداد سے مطلع کر دیں اور پیشگی رقم بھی روانہ کر دیں۔

(منیجر)

پندرھویں صدی کا آغاز اسلام کے عروج نو کا آغاز ہے

پھر ہی عرصہ بعد اسلامی سنہ ہجری کی بنیاد پڑی صدی کا آغاز ہونے والا ہے تو اگر دنیا کے مسلمان اس شاندار تقریب کو منانے کی تیاری کر رہے ہیں، رسالے بھر لندن، حیدرآباد نوکی کئی ۱۴ سو برس پورے ہو جائیں گے مصریوں کا کہنا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے منتشر اور باہم ایک دوسرے کے دشمن انسانوں کو نہ صرف مربوط کیا بلکہ انہیں بھائی بھائی بنا دیا، اسلامی عقیدہ اور نظریہ کے مطابق تمام انسان خواہ وہ کسی رنگ و نسل کے ہوں، ان کی زبان کچھ ہو وہ کالے ہوں یا گورے سب، اسلامی برادری کے لئے قابل قبول ہیں، جناب عصمتی مرتبت کے لہجے سے، اس نظریہ نے دنیا کو جو کچھ دیا اور عالم انسانیت کو جس طرح متحد کیا وہ تاریخ کا حصہ ہے اسلام کی دنیا پر یہ ایک ناقابل انکار احسان ہے اور ہر سال کے مگر آج بھی مسلمان نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کی ایک کروڑ کی آبادی ہے اور دنیا کی یہ مجال نہیں کہ انہیں نظر انداز کر دے یہ ایک کروڑ مسلمان ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کعبہ کے ماننے والے ہیں اور وہ حال رہتے ہیں، باہم وہ ایک ملت ہیں، اسلام اپنے ماننے والوں کو تلقین کرتا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، اور مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم اور اس کے فضائل کے حصول یا نفع و نقصان کے نقطہ نظر سے نہیں دی گئی بلکہ اسلامی برادری کی اخلاقی بلندی اور وہ حال عظمت کی نقیب ہے، اسی برادری اور برابری نے مختلف نسلوں، و تہذیبوں کے انسانوں کو باہم گھل شیر و شکر کر دیا یہ وہ حال بلندی اسلامی برادری کا کرشمہ ہے باہم پیوستہ رہنے میں بڑی محمود و معاون ہوئی اور عیسائیت ایک مسلمان کے سب کے حقوق کی برابر ملنے گئے خواہ وہ نماز کا متبع ہو یا روزے کا۔ رنج کو جانا ہو یا زکوٰۃ کا ادائیگی۔ تعلقات کی کوئی قسم ہو مسلمان باہم روحانی اور مذہبی طور پر باہم بھائی اور برابر ہیں۔

اسلام کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مادیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ روحانیت اور آخرت کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ اسلام اپنے پیروؤں کو تعلیم دیتا ہے کہ اگر دولت پڑے تو اسلام کے لئے اپنی جان قربان کر دو اور آخرت پر نظر رکھو۔ زندہ رہنے کے لئے بتاتا ہے کہ دنیا میں جب کوئی کام شروع کرو تو پہلے سوچ کر کرو کہ نتیجہ اس کا کیا نکلے گا اور ہمیشہ زندہ رہنا ہے مگر جب مذہب کا سوال آ جائے تو اس طرح عبادت کرو اور یوں خدا کو یاد کرو گویا کل ہی اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی ذہنی تربیت ایسے طریقے سے کی گئی ہے کہ دین و دنیا ایک کر دی گئی ہیں، اسلام کی تاریخ کے ۱۴ سو سالہ دور میں ہمیشہ حق کا ساتھ دینے کی تلقین

سربلند رہے ہیں اور باطل سے سمجھوتے کی اسلام نے کبھی اجازت نہیں دی۔ اسلام جہاں اور لاطل کے سخت خلاف ہے اور بے خطر کا سیاہی کی منزل تک پہنچنے میں سب سے بڑا رکاوٹ ہے لہٰذا مسلمانوں کے لئے حصول علم ایک فرض ہے، اسی سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جھوٹ مذہب سے تحریر کرتے رہیں اور خدا کے بندوں کو خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں وہ غلط کار ہیں اور گم کردہ راہ ہیں جو لوگ فتنہ سے انکار کرتے ہیں، انہیں خدا کبھی معاف نہیں کرے گا جب ایسے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے احکام پر عمل کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی راہ بہتر ہے جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے باپ دادا جاہل اور گمراہ تھے، اور علم کی روشنی سے انہوں نے اکتساب فیض نہ کیا تھا۔

قرآن کریم نے لفظ کسی سب سے کوئی بات یقین نہیں کیا ہے مسلمانوں کو فرض ہے جو بات زبان سے ادا کریں اس پر عمل کریں، کہا گیا ہے جس پر عمل کرو اور کہو، مسلمان کامیاب و کامران ہے قرآن کریم کی تلاوت کرنا ثواب ہے اور ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں ہر مسلمان کے لئے فرض ہے قرآن کریم حفظ کرے، ان میں ہے اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھے اور اس کے مطالب کو سمجھے، اور اس پر عمل کرے، اور یہ صحیح قال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

اتحاد ہی سے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے خواہ یہ اسلامی حکومت کے لئے ہو یا مسلمان جہاں دنیا کے کسی حصے میں ہے عربی سے تھوڑا بہت ضرور آشنا ہے اس کے علاوہ عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی ثقافت و تہذیب سے بھی دنیا، اسلام کے حوالے سے آشنا ہوئی۔ عالم تجھ کے لوگوں نے عربی، اس لئے سیکھی کہ قرآن کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں، اور اس پر عمل کر سکیں اور یہ صورت حال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

اتحاد ہی سے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے خواہ یہ اسلامی حکومت کے لئے ہو یا مسلمان جہاں دنیا کے کسی حصے میں ہے عربی سے تھوڑا بہت ضرور آشنا ہے اس کے علاوہ عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی ثقافت و تہذیب سے بھی دنیا، اسلام کے حوالے سے آشنا ہوئی۔ عالم تجھ کے لوگوں نے عربی، اس لئے سیکھی کہ قرآن کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں، اور اس پر عمل کر سکیں اور یہ صورت حال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

اتحاد ہی سے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے خواہ یہ اسلامی حکومت کے لئے ہو یا مسلمان جہاں دنیا کے کسی حصے میں ہے عربی سے تھوڑا بہت ضرور آشنا ہے اس کے علاوہ عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی ثقافت و تہذیب سے بھی دنیا، اسلام کے حوالے سے آشنا ہوئی۔ عالم تجھ کے لوگوں نے عربی، اس لئے سیکھی کہ قرآن کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں، اور اس پر عمل کر سکیں اور یہ صورت حال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

اتحاد ہی سے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے خواہ یہ اسلامی حکومت کے لئے ہو یا مسلمان جہاں دنیا کے کسی حصے میں ہے عربی سے تھوڑا بہت ضرور آشنا ہے اس کے علاوہ عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی ثقافت و تہذیب سے بھی دنیا، اسلام کے حوالے سے آشنا ہوئی۔ عالم تجھ کے لوگوں نے عربی، اس لئے سیکھی کہ قرآن کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں، اور اس پر عمل کر سکیں اور یہ صورت حال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

اتحاد ہی سے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے خواہ یہ اسلامی حکومت کے لئے ہو یا مسلمان جہاں دنیا کے کسی حصے میں ہے عربی سے تھوڑا بہت ضرور آشنا ہے اس کے علاوہ عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی ثقافت و تہذیب سے بھی دنیا، اسلام کے حوالے سے آشنا ہوئی۔ عالم تجھ کے لوگوں نے عربی، اس لئے سیکھی کہ قرآن کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں، اور اس پر عمل کر سکیں اور یہ صورت حال پہلی صدی ہجری میں پیش آئی تھی فلسفہ، تاریخ، ریاضی اور طبیعیات کے علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے فلسفہ، منطق، نظریات، ریاضیات، سائنس، طب عربی زبان کا جزو بن گئے، بڑے بڑے برگزیدہ لوگ ان علوم پر دسترس حاصل کی، یہاں تک کہ جب عربوں کی سلطنت کو زوال ہوا تو یہی عربی زبان اور عرب ثقافت اور عربی علوم ترقی کرتے رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قرآن کریم مشعل ہدایت تھا ہے اور رہے گا اور یہ صحیفہ ہسپانوی عربی میں ہے لہٰذا عربوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ عربی زبان کو زوال نہ آیا۔

بقیہ صفحہ ۱۴

ان ہی کی دولت آج کفر و الحاد کے فروغ میں استعمال کی جا رہی ہیں، زنگون کا دائرۂ اسلام میں آجانا سب سے آسان امر تھا، اسی طرح مصر میں شاہی خاندان کے ایک فرد اپنی دولت میں شہرۂ آفاق تھے تو ان کی دولت قبطیوں کو دولت اسلام سے مالا مال نہیں کر سکتے تھے، خواجہ حسن نظامی صاحب نے لکھا تھا اُن کا ایک مُرید کروڑوں سالانہ کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے، امید کہ ان کی دولت ضائع نہیں ہوئی ہوگی۔

ہمارے شہر میں ایک رئیس تھے، صدیوں کی دولت اُن کے پاس تھی، مشہور تھا کہ گاہے گاہے اشرفیاں دھوپ میں سکھائی جاتی ہیں، مگر جب رجواڑے گئے، ریاستیں گئیں، زمینداریاں گئیں اس میں بھی خدا معلوم کیا رہا کیا نہ رہا، اور آجکل ہی شہر لکھنؤ کا شہر کہلاتا ہے، یورپ اور امریکہ سے اس کی براہ راست تجارت ہے، کتنے غیر مسلم ہیں جن سے ان کے تعلقات ہیں ایک جانب تعلقات ہیں ایک جانب دولت ہے، بات کہاں سے کہاں جا سکتی ہے اور پرواہ نہ کرو تو یہ بھی سب وہاں جا رہا ہے جہاں ان سے پہلوں کا گیا، مدینہ شریف میں عبدالکریم دارا تھے، کہتے تھے میں نے کلکتہ میں بیس کروڑ روپیہ کمایا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ ایک پیسہ نہیں بچا، خود آدم جی وغیرہ جن کے کروڑوں اربوں کے کاروبار تھے، ڈھاکہ میں چارگام میں، اسی ملک میں جس کے ہر ہر گاؤں میں عیسائی مشن مسلمانوں کو ورغلانے میں لگے ہوتے ہیں، یہ لوگ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب بھی کیا نہیں کر سکتے ہیں۔ ڈھاکہ میں ہمارے دفتر میں ایک ملازم تھا اس نے بتایا کہ مشن والے مجھ سے اچھی ملازمت اور شادی کا وعدہ کرتے ہیں اور دس ہزار نقد دیتے ہیں۔ خدا معلوم غریب ان کے دام سے بچ سکا یا نہیں۔

کہ مدینہ اور ریاض کا تو ایک ایک آدمی لاکھوں انسانوں کا ثواب لے سکتا ہے، اسی طرح کویت امام اور جدہ جیسے عالمی شہر ایک عالم کو جیت سکتے ہیں، اور خدا کرے ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے ورنہ جان لیں یہ دولت رہنے والی نہیں، یہ تو چلتی پھرتی چھاؤں ہیں، آج یہاں ہے کل وہاں۔ آج اسلام میں لگا دو کے سب جنت ہی میں جائے گی، اگر تذبذب میں رہ گئی ہاتھ سے نکل جائے گی اور جہنم میں جائے گی۔